فرحت اشتیاق

کب ہاتھ میں ترا ہاتھ نہیں

مکمل ناول

اماں کے انتقال کو سترہ روز ہو چکے تھے اور ان سترہ دنوں میں وہ اتنا رو چکی تھی کہ اب تو اسے ایسا لگتا تھا کہ شاید وہ زندگی میں دوبارہ کبھی رو ہی نہیں سکے گی۔ آنکھیں بالکل خشک اور ویران۔ چہرہ برسوں کا بیمار اور زرد' وہ خود سے مکمل غافل ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دنیا میں اب جینا بڑا ہی فضول اور بے کار سا کام ہے۔ کیوں روز صبح ہو جاتی ہے۔ یہ قیامت آخر آ کیوں نہیں جاتی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا' کسی روز صبح آنکھ کھلے تو پتا چلے' ساری دنیا تہہ و بالا ہو چکی ہے اور وہ

دن آگیا ہے جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے اور اماں کے مشترکہ کمرے میں بستر پر لیٹی ایک ٹک چھت کو گھورتے ہوئے خالی الذہنی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ اتنے دنوں میں محلے والوں نے اس کا بے حد خیال رکھا تھا۔ کھانا کسی کے گھر سے آ رہا ہے تو چائے کسی کے گھر سے۔ کبھی کوئی اس کا دل بہلانے کو اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتا کبھی کوئی۔ اس نفسا نفسی کے دور میں اہل محلہ کی یہ اپنائیت اور خلوص شاید اماں کی بے غرض چاہتوں کا جواب تھا۔ اماں جن کا مسلک محبت تھا' وہ اپنے پرائے سب کے لیے گھنی چھاؤں کی مانند تھیں۔ ان کا خمیر محبت' خلوص اور رواداری سے اٹھایا گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کے مرنے پر اپنے تو اپنے غیروں نے بھی اشک برسائے تھے۔ ہر آنکھ ان کی دائمی جدائی کے دکھ پر اشک بار تھی۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر حسن اندر آیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اتنے دنوں میں وہ پہلی بار اس کے پاس آیا تھا۔ فاطمہ نے اس کی طرف غور سے دیکھا تو وہ بہت تھکا ہوا اور نڈھال سا لگا۔ ایک نظر اس پر ڈال کر وہ اس کے بیڈ کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ جو اپنے خیال سے تمام آنسو بہا چکی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اس کے رونے کی شدت میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا اور وہ چپ چاپ سامنے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔ حسن اس کے

لیے پانی لے آیا اور دھیرے سے اسے مخاطب کیا۔
"تھوڑا پانی پی لو۔"

اس نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے اور دھندلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑی سنجیدہ نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی اس کی آنکھوں میں ہلکی سی بھی نمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر گئی اس نے گلاس اس کے ہاتھ سے واپس لے لیا اور دوبارہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ سامنے پینٹنگ پر نظریں جمائے گویا ہوا۔

"مانا کہ یہ دکھ بہت بڑا ہے۔ مگر ہمیں اسے برداشت کرنا پڑے گا۔ فاطمہ! خود کو سنبھالو۔ انسان اس مقام پر آ کر اتنا بے بس اور مجبور ہے کہ اپنے چاہنے والوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں منوں مٹی تلے سلا آتا ہے۔"

"لیکن میری اماں ہی کیوں۔ ان کے بجائے اور کوئی کیوں نہیں مر گیا؟" وہ عجیب بچکانہ اور ضدی انداز میں بولتی دوبارہ رونے لگی تو وہ بڑی بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

"دیکھو، تمہارے اس طرح رونے سے اماں کو تکلیف ہو رہی ہو گی۔ یاد ہے کتنا ناراض ہوتی تھیں وہ تمہارے رونے پر۔"

اس کی یہ بات کچھ کارگر ثابت ہوئی وہ اماں کو ناراض کرنے کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے چہرے کو خشک کرتے ہوئے بولی۔ "میں رو تو نہیں رہی۔"

"شاباش، اب رونا بھی نہیں۔ اگر اماں کی یاد آئے تو بجائے رونے کے ان کے لیے قرآن پڑھو۔ اللہ سے ان کی بخشش اور مغفرت کی دعائیں مانگو۔ تم دیکھنا ایسا کرکے تمہیں خود بھی بہت سکون ملے گا۔" وہ کچھ مطمئن ہو کر بولا۔ کچھ دیر توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

"تم نے کچھ کھایا؟"

"وہ زکیہ آنٹی نے کھانا بھجوایا تو تھا۔ لیکن میرا دل نہیں چاہ رہا تھا، اس لیے ایسے ہی کچن میں رکھ دیا۔"

وہ اس کے اتنے پُرسکون انداز پر حیران ہو رہی تھی۔ کیا حسن کو اماں کے چلے جانے کا کوئی غم نہیں۔ نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں خود گواہ ہوں۔ یہ اماں سے کتنا پیار کرتا تھا۔ شاید دنیا میں سب سے زیادہ۔ پھر اس وقت یہ اتنا مطمئن اور پرسکون کس طرح ہے۔

وہ اس کی سوچوں سے بے نیاز اسی پُرسکون لہجے میں بولا "آؤ۔ پھر کھانا کھاتے ہیں۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔"

وہ کھڑا اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا، وہ ناچار اس کے ساتھ کمرے سے نکل کر کچن میں آ گئی اور زکیہ آنٹی کی بھیجی گئی ٹرے اٹھا کر ڈائننگ ٹیبل پر لا کر رکھ دی۔ وہ بڑی خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک آدھ نظر اس کی طرف بھی ڈال لیتا تھا جو پلیٹ میں ڈلے چاولوں سے کھیل رہی تھی۔ اس نے شاید ایک نوالے کے بعد کچھ اور کھایا ہی نہیں تھا۔ اس نے اسے ٹوکا نہیں اور تھوڑے سے چاول کھا کر اٹھتا ہوا بولا۔

"میں تمہارے لیے بڑی مزے دار سی چائے بنا کر لاتا ہوں۔" وہ کوئی جواب دیے بنا یونہی بیٹھی اس کرسی کو دیکھتی رہی جس پر اس کی پیاری اماں بیٹھا کرتی تھیں۔ وہ چائے بنا کر لایا تو وہ اپنے برابر موجود اس کرسی کی گدی پر ہاتھ پھیر رہی تھی شاید منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔ وہ قصداً اس منظر سے نگاہیں ہٹا کر بڑی خوش دلی سے بولا۔

"او ذرا چکھ کر بتاؤ۔ کیسی چائے بنائی ہے میں نے؟" فاطمہ کے لیے اس کے تمام رویے حیران کن تھے۔ کیا وہ پتھر کا ہو چکا ہے۔ "یہ روتا کیوں نہیں۔ اسے میرے ساتھ مل کر رونا چاہیے۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی۔

"فاطمہ! مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے حسن کی آواز سنی۔ اس

نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ کپ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"وہ بات یہ ہے کہ" وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر پتا نہیں کیا سوچنے لگا تھا۔ جیسے اپنی بات کہنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ اس کے لیے تو آج حسن کا ہر انداز ہی نرالا اور انوکھا تھا۔ وہ اتنا پُراعتماد اور دو ٹوک انداز میں بات کرنے والا۔ آج اپنی بات کہنے کے لیے اسے اتنی مشکل کیوں پیش آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بہت جھجکتے ہوئے بولا۔

"جب تک اماں تھیں تب تک تو کوئی بات نہیں تھی مگر اب تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔" وہ ساکت رہ گئی۔ شاید اس کی سماعت نے دھوکہ کھایا ہے۔ جبکہ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔

"تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات، دیکھو، پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے ایک بہت ہی اچھے ہاسٹل میں تمہاری رہائش کا انتظام کر دیا ہے۔ تم وہاں آرام سے رہو گی۔ کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔ میں بھی آتا جاتا رہوں گا۔ پھر تم اگر چاہو تو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لینا۔ اس طرح مصروف ہو جاؤ گی اور تمہاری ادھوری تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی۔"

وہ اپنی بات مکمل کر کے اب اپنے ازلی اعتماد سے اس کو دیکھ رہا تھا اور اس کی سمجھ میں صرف یہ بات آ رہی تھی کہ وہ اسے اس کے اپنے گھر سے نکل جانے کے لیے کہہ رہا ہے۔ برسوں پہلے کسی کا کہا جملہ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔

"آج سے تم میری بیٹی ہو اور یہ گھر تمہارا ہے۔ یہاں کی ہر چیز تمہاری ہے، جیسے چاہے استعمال کرو۔ کبھی اس گھر کو پرایا مت سمجھنا۔ اگر تم نے ایسا سمجھا تو میں اسی وقت تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔"

وہ اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے بے نیاز کہہ رہا تھا۔ "کل میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔ تم رات بھر میں جتنی پیکنگ کر سکتی ہو کر لو۔ جو چیزیں رہ جائیں گی وہ بعد میں آتی رہیں گی۔ فی الحال جو ضروری چیزیں ہیں وہ پیک کر لو۔ میں کل صبح ناشتے کے بعد تمہیں چھوڑ آؤں گا۔" اس کا جواب سنے بغیر وہ اٹھ گیا اور ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس نے جس گھر میں آنکھ کھولی وہ ایک چھوٹا سا دو کمروں پر مشتمل بوسیدہ سا مکان تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے چار مردہ بچوں کی پیدائش نے اس کی بیمار اور کمزور ماں کو وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنی ماں کو سلائی مشین پر جھکے محلے والوں کے کپڑے سیتے اور مسلسل کھانستے ہی دیکھا تھا۔ ان دنوں وہ سوچا کرتی کہ پتا نہیں اس کی ماں ہر وقت بیمار کیوں رہتی ہے۔ گھر میں بس وہ دونوں ماں بیٹی رہتی تھیں۔ ابا کبھی کبھار آتے، ان کے آتے ہی وہ کسی کونے میں چھپ جاتی۔ وہ چیخ چیخ کر ماں سے لڑتے، اپنے نشے کے لیے ماں کی محنت کی کمائی چھینتے اور جو ماں دینے سے انکار کرتی تو اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتے اور وہ کسی کونے میں دبکی یہ سب دیکھے جاتی۔ اس کا دل چاہتا، ابا کے سامنے جا کر کھڑی ہو جائے اور ان سے چیخ کر کہے۔

"مت اٹھاؤ میری ماں پر ہاتھ۔ اب اگر ہاتھ اٹھایا تو تمہارا ہاتھ توڑ دوں گی۔" مگر وہ آٹھ نو سالہ بچی یہ سب سوچ ہی سکتی تھی۔ کبھی عمل نہ کر سکی۔ اس کے ددھیالی رشتہ دار تو ان کی غربت اور ابا کی بری صحبت اور نشہ جیسی لعنت کی وجہ سے ان سے ملتے نہ تھے اور ننھیال میں سوائے ایک خالہ کے اور کوئی تھا ہی نہیں۔

خالہ کبھی سال دو سال میں چکر لگاتیں۔ اماں لاکھ ان کے سامنے بھرم رکھنے کی کوشش کرتیں مگر وہ سب جانتی تھیں ہر بار اصرار کرتیں۔

"میرے ساتھ کراچی چلو، تمہارا علاج کرواؤں گی۔ کیوں ایسے آدمی کے پیچھے اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔" مگر اماں ہر بار ان کو ٹال دیتیں۔

جس روز اس کے ابا کار ایکسیڈنٹ میں مارے

گئے۔ وہ بے تحاشا خوش ہوئی تھی۔ اپنے سگے باپ کے مرنے پر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ "ہاں' اب وہ کبھی میری اماں کو مارنے اور ان سے پیسے چھیننے نہیں آیا کریں گے۔" اس کی ماں پتا نہیں کس مٹی کی بنی تھی' ایسے شخص کے لیے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی جو اس کے لیے ہمیشہ باعث آزار رہا۔

اماں سے شاید ابا کی جدائی برداشت نہ ہو رہی تھی یا وہ ان کے ہاتھوں پٹنے کی اتنی عادی ہو چکی تھیں کہ ان کے مرنے کے تین ماہ بعد خود بھی ملک عدم کی جانب روانہ ہو گئیں۔ وہ اپنے تنہا رہ جانے پر حیران پریشان اپنے گرد موجود لوگوں کو دیکھ رہی تھی جب وہ مشفق ہستی آگے بڑھی اور اسے اپنے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اسے خالہ میں سے اماں کی خوشبو آ رہی تھی' وہ ان کے گلے لگی سہمی نگاہوں سے اماں کے مردہ وجود کو دیکھتی رہی۔

خالہ اپنے بیٹے کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ تو سوئم کے بعد ہی چلا گیا جبکہ خالہ اس کے پاس رک گئیں۔ وہ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کرتیں۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتیں۔ "رونا نہیں۔ تم تو میری بہت پیاری بیٹی ہو۔ اور تمہاری اماں تو میں ہوں۔ تم مجھے اماں کہا کرو۔" اسے بس یہ پتا تھا کہ ان کے پاس سے اماں کی خوشبو آتی ہے' ان کی شکل اماں جیسی ہے اور وہ مطمئن ہو کر ان کے بازو پر سر رکھ کر سو جاتی۔

مہینہ بھر وہ یہاں نواب شاہ میں اس کے ساتھ رہیں اور پھر ایک روز اس سے بولیں۔ "چلو میری جان! میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی' میری صفیہ کی نشانی۔" وہ اسے سینے سے لگا کر دوبارہ رونے لگیں اور وہ چودہ سالہ لڑکی بغیر کوئی سوال کیے ان کے ساتھ چلی آئی۔

خالہ نے اس ایک ماہ کے قیام کے دوران اس کا گھر اور گھر میں موجود تمام سامان فروخت کر دیا تھا۔ گو اس وقت وہ بہت چھوٹی اور ناسمجھ تھی مگر پھر بھی اسے اپنے اس کھنڈر نما گھر کے ڈیڑھ لاکھ روپے میں بک جانے پر خاصی حیرت ہوئی تھی۔ وہ خالہ کی ذہانت کی دل ہی دل میں معترف ہو گئی تھی۔ وہ اس کی ماں کے برعکس بڑی پُراعتماد سی تھیں۔ مکان کی فروخت کے سلسلے میں فاطمہ نے انہیں کتنی ہی بار مختلف مردوں سے خود اعتمادی اور برابری کی سطح پر بات کرتے دیکھا تھا۔

نواب شاہ سے کراچی تک کا سفر خالہ کی سنگت میں کٹا۔ وہ راستے بھر اسے کراچی کے بارے میں بتاتی رہیں۔ ان دنوں اس کے لیے کراچی لندن اور نیویارک جتنا دور اور ناقابل رسائی شہر تھا۔ عزیز آباد میں واقع وہ سوا سو گز کا مکان اسے اپنے کھنڈر کے مقابلے میں جنت محسوس ہوا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی خالہ نے اس سے کہا تھا۔

"آج سے تم میری بیٹی ہو اور یہ گھر تمہارا ہے۔ یہاں کی ہر چیز تمہاری ہے۔ جیسے چاہے استعمال کرو۔ کبھی اس گھر کو پرایا مت سمجھنا۔ اگر تم نے ایسا سمجھا تو میں اسی وقت تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔"

حسن نے اس کے آنے پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا تھا۔ نہ اسے گرم جوشی سے مسکرا کر خوش آمدید کہا تھا اور نہ ہی منہ بگاڑ کر اس کے آنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ وہ بڑا کم گو اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا لڑکا تھا۔ صبح یونیورسٹی چلا جاتا اور واپس آ کر یا اپنی کتابوں میں گم ہو جاتا یا کمپیوٹر کے آگے بیٹھا رہتا۔ وہ فاطمہ سے پانچ سال بڑا تھا مگر اس کی سنجیدگی اور بے پروائی سے خائف ہوتے فاطمہ کو وہ اپنے سے دس پندرہ سال بڑا محسوس ہوتا تھا۔ رہ گئیں اماں تو وہ اس پر اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار تھیں۔ ان کی بے تحاشا محبت پر وہ حیران رہ جاتی۔ ان کی چاہت میں اتنی وارفتگی اور سچائی تھی کہ وہ کچھ ہی عرصے میں اپنے ماں باپ اور نواب شاہ کے اس چھوٹے سے گھر کو بھول گئی۔ اس کے لیے اچھے اچھے کپڑے بنا رہی ہیں۔ اسے اس کی پسند کی چیزیں پکا کر کھلا رہی ہیں۔ ان کا سارا دن اس کی سیوا میں گزر جاتا اور وہ کم عمر اور محبت سے محروم اور بزدل سی لڑکی اپنے لیے ان کی اتنی محبت اور چاہت پر حیرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہ جاتی۔

اس کی ماں اور اماں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بظاہر ایک ہی ماں باپ کی اولاد وہ دونوں بہنیں ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ حالانکہ نانا' نانی نے تو دونوں ہی بیٹیوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہوئے انہیں آٹھ جماعتیں پڑھا کر رخصت کر دیا تھا۔ اب شاید یہ نصیب کی بات تھی کہ اس کی ماں کے مقدر میں ابا جیسے بدقماش' شرابی اور جواری کی بیوی بننا لکھا تھا اور اماں کی قسمت میں خالو جیسے اچھے انسان کا ساتھ لکھا تھا۔ خالو نے شادی کے بعد اماں کو بی اے تک پڑھوایا تھا۔ وہ خود بڑے قابل آدمی تھے۔ انہوں نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کرنے کے بعد ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا ہوا تھا اور کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کہتے ہیں کہ اگر آپ کے پاس پیسے ہیں تو نئے جوتے مت خریدیں بلکہ کوئی کتاب خرید لیں۔ اسے یہ تمام باتیں اماں نے بتائی تھیں۔

وہ جب بھی خالو کا ذکر کرتیں ان کے چہرے پر اتنے خوبصورت رنگ بکھر جاتے کہ وہ مبہوت ان کو دیکھتی رہ جاتی۔ انہوں نے خالو کے ساتھ بڑی خوشگوار ازدواجی زندگی گزاری تھی۔ وہ بتاتیں کہ شادی کے دس سال بعد تک ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی مگر خالو نے اس بات پر کبھی انہیں تنگ نہ کیا بلکہ الٹا ہمیشہ انہیں دلاسا دیتے کہ یہ خدا کی مرضی پر ہے' وہ اگر چاہے تو ہمیں اولاد دے اور اگر ہمارے نصیب میں نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ ہم اس کی رضا میں راضی ہیں۔

پھر دس سال بعد ان کے سونے آنگن میں حسن عباس کی آمد ہوئی تو ان کی زندگی میں بہار آ گئی۔ خالو نے اسے بہترین تعلیمی ادارے میں داخلہ دلوایا۔ وہ اپنے بیٹے کو خوب لائق فائق اور کامیاب دیکھنا چاہتے تھے مگر جب حسن صرف چھ سال کا تھا' وہ اماں اور حسن کو اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مگر ان کا دیا ہوا اعتماد اور محبت اماں کا زادِ راہ بن گئی۔ انہوں نے اپنی تعلیم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک اچھے

انگلش میڈیم اسکول میں نوکری کرلی اور بیٹے کی تعلیم اور دیگر ضروریات میں کبھی کوئی کمی نہ آنے دی، جس سے اسے احساس ہو کہ میرا باپ نہیں ہے۔ خالو ایک خوددار اور وضع دار انسان تھے اس لیے ترکے میں کوئی لمبی چوڑی جائیداد چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ بیوی اور بیٹے کے لیے یہ مکان ہی ان کا کل سرمایہ تھا۔ اماں بتاتی تھیں کہ وہ بڑے انا والے اور غیور تھے ساری زندگی کسی کی خوشامد نہ کی۔ کسی سے اس خیال سے نہ ملے کہ یہاں سے کوئی فائدہ حاصل ہوگا اور ان خصوصیات کے حامل شخص کا ترکہ اس سے زیادہ کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

اماں نے اسے اپنے ہی اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ وہ نواب شاہ سے نویں جماعت میں پڑھتی ہوئی آئی تھی۔ کہاں اس کا وہ چھوٹا سا سرکاری اسکول اور وہاں کی نیم خواندہ ٹیچرز اور کہاں یہ بڑا انگلش میڈیم اسکول اور اس کے قابل اساتذہ۔ گو وہ پڑھنے میں اچھی تھی مگر اس کی انگریزی بہت کمزور تھی اور یہاں تمام مضامین انگریزی ہی میں پڑھائے جاتے تھے، اس لیے وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ یہاں بھی اماں ہی اس کے کام آئیں، اسکول سے آکر وہ روزانہ تین چار گھنٹے اسے انگلش سکھایا کرتیں۔ شروع میں اسے مشکل پیش آئی مگر آہستہ آہستہ وہ سیکھتی چلی گئی۔ مگر پھر بھی اسے اپنی کلاس فیلوز کی طرح روانی سے انگریزی بولنی نہیں آسکی تھی۔ اس کا دل چاہتا، وہ اپنی سہیلیوں کی طرح فرفر انگریزی بول سکے یا اماں کی طرح ٹی وی پر انگریزی پروگرام دیکھ سکے اور انگریزی اخبار پڑھ سکے۔ اماں اس کی ان باتوں پر اسے تسلی دیا کرتیں کہ اسے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ انشاء اللہ یہ سب کچھ محنت اور کوشش سے سیکھ جائے گی۔

اسے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ حسن سارا دن گھر سے باہر کہاں رہتا ہے۔ صبح وہ یونیورسٹی چلا جاتا۔ وہاں سے آکر کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتا اور دوبارہ گھر سے غائب ہو جاتا پھر رات کو واپس آکر اپنے کمرے میں بند ہو کر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ وہ ان دنوں بی ایس سی کر رہا تھا۔

اس کے استفسار پر اماں نے اسے بتایا تھا کہ وہ شام میں کسی کوچنگ سینٹر میں پڑھاتا ہے۔ اسے اپنے تعلیمی اخراجات کے لیے ماں سے پیسے لینے اچھے نہیں لگتے۔ اماں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"بالکل اپنے بابا پر گیا ہے۔ ہر بات پر اس کی ناک نیچی ہوتی ہے۔ اسے لیول تک بھی پتا نہیں کیسے خاموش رہ گیا۔ اب کہتا ہے کہ مجھے تو یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ آپ گھر کا خرچ چلانے کے لیے نوکری کر رہی ہیں کجا کہ میں اپنے ذاتی خرچوں کے لیے آپ سے رقم لوں۔"

وہ بڑا پڑھاکو اور جینئس تھا، فاطمہ اس سے بڑی طرح مرعوب تھی۔ ان دونوں کے درمیان بڑی رکی سی بات چیت ہوتی تھی۔ وہ گھر پر ٹکتا ہی بہت کم تھا۔ اماں اور اپنے دو چار دوستوں کے علاوہ وہ کسی کو بھی خود سے بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس کا کمرہ فرسٹ فلور پر تھا۔ وہ زیادہ وقت وہاں اپنے کمپیوٹر کے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ کبھی کبھار اس کے دوست کمبائن اسٹڈی کے لیے اس کے ساتھ آجاتے تو وہ انہیں پچھلی طرف والے دروازے سے ڈائریکٹ اوپر اپنے کمرے میں لے جاتا۔

اماں بظاہر بڑی پڑھی لکھی ورکنگ وومن تھیں مگر بعض معاملات میں وہ بہت قدامت پسند تھیں۔ وہ خود بھی سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر گھر سے نکلا کرتیں اور اسے بھی ایسا ہی کرواتیں۔ اس لیے اس کے آنے کے بعد اس کے دوستوں کی آمد و رفت پچھلے دروازے سے ہوتی اور وہ اوپر خالو کی لائبریری یا حسن کے کمرے میں جمع ہو کر پڑھا کرتے۔ ایک آدھ دفعہ وہ چائے لے کر اوپر گئی اور دروازے پر دستک دے کر اسے ٹرے پکڑائی تو اس نے ہمیشہ یہی دیکھا کہ وہ ماسٹر صاحب بنا اپنے دوستوں کو کچھ نہ کچھ سمجھا رہا ہے۔ بعد میں جب اس نے اماں کو یہ بات بتائی کہ کمبائن اسٹڈی کا تو صرف بہانا ہے اس کے دوست اس سے مفت میں ٹیوشن پڑھنے آتے ہیں تو اماں اس کی بات پر ہنسی تھیں اور پھر اس سے کہا تھا کہ اگر وہ دوستوں کو پڑھا رہا ہے تو!

کسی اور طرح ان کے کام آرہا ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ دوسروں کے کام آنا عین ثواب ہے۔ وہ "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔" کی عملی تفسیر تھیں۔

وقت کچھ اور آگے بڑھا، وہ میٹرک کرکے کالج میں آگئی۔ اسکول تک تو اماں کا ساتھ تھا، وہ ان ہی کے ساتھ جاتی اور آتی تھی۔ اب کالج جانے کا مرحلہ آیا تو اماں نے اسے قریب ترین سائنس اینڈ کامرس کالج میں داخلہ دلوا کر اس کی پریشانی کم کردی۔ وہ باوجود دو سال یہاں رہنے کے اپنے اندر کا ڈر اور خوف ختم نہ کر سکی تھی۔ اماں کے بغیر وہ کبھی اکیلی محلے میں کسی کے گھر نہ گئی تھی۔ کالج پیدل کا راستہ ہونے کے باوجود وہ فرناز اور صنوبر کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ اگر کسی روز وہ چھٹی کرلیتیں تو خود بھی اکیلے جانے کے خوف سے چھٹی کرکے گھر بیٹھ جاتی۔ شاید یہ خوف اس کے اندر بچپن ہی سے بیٹھ گیا تھا۔ جب ابا شراب کے نشے میں دھت اماں کو مارا پیٹا کرتے تھے یا کوئی اور بات تھی مگر وہ اپنے اندر اعتماد پیدا کرنے میں ہنوز ناکام تھی۔ مزید کسر اماں کے لاڈ پیار نے پوری کردی تھی وہ اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھتیں۔ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر سلایا کرتیں۔ گلی کے آخر میں فرناز کے گھر بھی اگر اسے جانا ہوتا تو اماں خود چھوڑ کر آتیں۔

ان ہی دنوں حسن نے بی ایس سی میں ٹاپ کرنے کے ساتھ گولڈ میڈل اور مزید تعلیم کے لیے امریکہ کی اسکالرشپ اپنی یونیورسٹی کی جانب سے حاصل کی تو اماں خوشی سے پاگل ہو گئیں۔ شاید اپنی ریاضت کا میٹھا پھل انہیں خوش کر رہا تھا یا عزیز از جان شوہر کے سامنے سرخروئی پر وہ شاداں تھیں، فاطمہ سمجھ نہ سکی۔ وہ خود بھی اب اس گھر کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ اس لیے اس خوشی میں وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ شریک تھی۔ اس نے حسن سے ٹریٹ کی فرمائش کی تو اس نے مسکرا کر ہامی بھرلی اور پھر رات میں وہ اسے آئس کریم کھلا کر لایا۔ اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر جانے اور آئس کریم کھانے کو اس نے خوب انجوائے کیا تھا۔

مگر اس روز ناشتے کی میز پر حسن نے اسے اور اماں کو بری طرح حیران کر دیا۔

وہ یونیفارم پہنے حسبِ معمول ناشتہ کرنے میں نخرے دکھا رہی تھی اور اماں اسے چمکار چمکار کر زبردستی کھلا رہی تھیں۔ اسی وقت حسن بڑا تیار ہو کر ڈائننگ روم میں آیا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو اماں پوچھنے لگیں۔

"خیریت! اتنی صبح صبح کہاں جا رہے ہو؟"

جواب میں وہ بڑے اطمینان سے چائے پیتے ہوئے بولا۔

"آج میری جاب کا پہلا دن ہے۔ دیکھ نہیں رہیں آپ، کتنا تیار ہو کر جا رہا ہوں۔" وہ بڑی شگفتگی سے مسکرایا اور اماں کا تو یہ حال تھا کہ منہ پھاڑے اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے چہرے پر نظریں ڈالے بغیر ناشتہ کرنے میں مصروف رہا۔ کافی دیر تک جب وہ اپنی بات کی وضاحت میں مزید کچھ نہ بولا تو اماں بڑی دقتوں سے خود کو بولنے کے لیے آمادہ کر پائیں۔

"حسن! تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کیا الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو۔" غصے سے زیادہ ان کے لہجے میں افسوس کی جھلک تھی۔

"میری سوئیٹ اماں! اس میں دماغ خراب ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ کے بیٹے کو بغیر کسی سفارش کے اتنی اچھی فرم میں جاب ملی ہے اور آپ ناراض ہو رہی ہیں۔" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بڑے مطمئن انداز میں بولا۔ تو اماں اپنا غصہ دبا نہ پائیں۔ "حسن! بند کرو یہ بکواس، بجائے اپنے جانے کی تیاری کرنے کے تم یہ کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔"

"اماں پیاری! آپ نے وہ مقولہ تو ضرور سنا ہوگا کہ "Earning is better that learning" (کمانا علم حاصل کرنے سے بہتر ہے۔) بس میں بھی اسی پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔ اچھا باقی باتیں شام میں ہوں گی۔ خدا حافظ۔"

وہ بڑے سکون سے اپنی بات ختم کر کے چلا گیا اور اماں کتنی ہی دیر آنکھوں میں آنسو بھرے بیٹھی رہیں۔

رات کو کھانے کے بعد اماں کے گلے میں بانہیں ڈالے وہ انہیں منانے میں لگا ہوا تھا۔ ان کے گھر میں افراد ہی کتنے تھے جو ایک دوسرے سے کوئی بات چھپا سکی جاسکے۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ اماں کی ایک ہی رٹ تھی کہ وہ اتنے شاندار موقع سے فائدہ اٹھائے۔ اس سے بڑا بدقسمت اور کون ہوگا جو اعلا تعلیم کے اتنے سنہری موقع کو گنوا رہا تھا۔ اماں اسے لعن طعن کر رہی تھیں کہ اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے بابا کے خوابوں کو روندڈالے اور جواب میں وہ بڑے سکون سے کہہ رہا تھا۔

"پڑھنے کے لیے باہر جانا ضروری نہیں ہے۔ جنہیں پڑھنا ہوتا ہے وہ یہاں بھی پڑھ لیتے ہیں اور جن نکموں' نالائقوں کو نہیں پڑھنا ہوتا انہیں آپ دنیا کی اچھی سے اچھی یونیورسٹی میں بھیج دیں۔ وہ پڑھ کر نہیں دیں گے۔" جب کافی دیر کی بحث و تکرار کے بعد اماں رونے بیٹھ گئیں تو وہ کچھ جھنجلا کر بولا۔

"اماں! آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہیں۔ ہمارے مذہب میں تو والدین کو اکیلا چھوڑ کر جہاد تک کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ امریکہ جا کر پڑھنا جہاد سے افضل تو نہیں ہو سکتا۔ میں آپ لوگوں کو اکیلا چھوڑ کر ہرگز نہیں جا سکتا۔ آپ پلیز مجھے میری ذمہ داری نبھانے دیں۔ مجھے یقین ہے کہ بابا بھی میرے اس فیصلے سے خوش ہوں گے اور میں نے آگے پڑھنے سے انکار تو نہیں کیا۔ ایم سی ایس اور ایم بی اے کرنا میرے فیوچر پلانز میں شامل ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں خوب دولت اور ڈھیر ساری خوشیاں آپ کے قدموں میں ڈال دوں گا۔ بس تھوڑا سا انتظار کر لیں۔"

اماں نے جب یہ دیکھا کہ اسے کچھ بھی سمجھانا بے سود ہے تو مجبوراً چپ ہو گئیں۔ اس روز کے بعد اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی مگر اماں کچھ چپ چپ سی رہنے لگی تھیں۔ بیٹے کی ضد کے آگے بظاہر تو ڈال دیے تھے مگر دل ہی دل میں اس سے ناراض بھی تھیں۔ وہ ان کی ناراضی سے بے نیاز صبح آفس چلا جاتا۔ شام میں آفس سے فارغ ہو کر وہ کسی بہت اچھے کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ میں دو گھنٹے کی کلاس لے کر آتا۔ جاب اور انسٹی ٹیوٹ سے مل ملا کر اسے اچھے خاصے پیسے مل رہے تھے اس کے علاوہ وہ مختلف کمپنیز کے لیے پرائیویٹلی کمپیوٹر پروگرامنگ اور ویب سائٹ ڈیزائننگ کر دیا کرتا۔ جس کا اس کو خاصا معقول معاوضہ مل جایا کرتا۔

ابھی اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ حسن نے نیا شوشا چھوڑ دیا وہ اماں سے بضد تھا کہ وہ اسکول کی جاب چھوڑ دیں۔

"آپ نے بہت محنت کر لی۔ اب آپ آرام سے گھر میں رہیں۔ یہ گھر اور اس کی تمام ذمہ داری میری ہے۔"

اسے اماں کی گرتی ہوئی صحت کی بہت فکر تھی۔ اس کی یہ بات فاطمہ کو بھی بہت اچھی لگی تھی۔ ساری زندگی جدوجہد کرتے اور زندگی سے لڑتے وہ اب بہت تھک گئی تھیں۔ انہیں آرام کی شدید ضرورت تھی۔ ماں باپ ضد کر کے بچوں سے اپنی بات نہیں منوا سکتے جیسے اماں اس سے اپنی بات نہیں منوا سکی تھیں۔ مگر وہ بڑے اطمینان سے ان سے اپنی ضد منوا گیا تھا۔

جس روز اماں نے اسکول سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لی حسن بہت خوش تھا۔ ریٹائرمنٹ پر ملنے والا پیسہ انہوں نے حسن کے مشورے پر فاطمہ ہی کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیا تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں پہلے ہی نواب شاہ والے گھر کے پیسے بھی رکھے ہوئے تھے۔

اس روز چھٹی کا دن تھا۔ اماں دوپہر کے کھانے کا خاص اہتمام کرنے کچن میں گھسی ہوئی تھیں۔ فاطمہ کی فرمائش پر وہ نہاری اور شاہی ٹکڑے تیار کر رہی تھیں۔ حسن لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی پر شارجہ کپ کا فائنل جو پاکستان اور سری لنکا کے درمیان ہو رہا تھا دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی وہیں لاؤنج میں لیپ ٹاپ پر کچھ میڈم شیریں کا دیا اسائنمنٹ کرنے میں مصروف تھی۔ ٹی وی دیکھتے یونہی بے خیالی میں اس کی نظر فاطمہ پر پڑی جو بڑی بے زار سی شکل بنائے چپن منہ میں دبائے پتا نہیں کیا سوچنے میں مصروف تھی۔

"کیا ہوا۔ اتنی بری بری شکلیں کیوں بنا رہی ہو؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"میڈم شیریں نے ایک مشکل Essay (مضمون) لکھنے کے لیے دیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا لکھوں۔"

وہ رونی صورت بنا کر بولی تو وہ محظوظ نظروں سے اسے دیکھتا ہوا بولا "کس ٹاپک پر لکھنا ہے؟"

"نیوکلیئر کے فائدے اور نقصانات" وہ موضوع بتا کر دوبارہ اپنے کاغذ اور قلم کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ بولا۔

"اس میں مشکل کیا ہے۔ یہ تو انٹرسٹنگ اور آسان سا ٹاپک ہے۔ اوکے آؤ میں بتاؤں۔"

وہ شاید اس وقت بڑی فرصت سے بھی تھا اور موڈ بھی اچھا تھا جو اس سے اتنی تفصیلی بات کر رہا تھا۔ فاطمہ کی تو بہت بڑی مشکل آسان ہو گئی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گئی اور نوٹ بک اور پین اسے پکڑا دیا۔ وہ قلم اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

"اچھا لکھنے کے لیے اچھا پڑھنا بہت ضروری ہے۔ تم کورس کی کتابوں کے علاوہ دوسری اچھی کتابیں بھی پڑھا کرو۔ اس سے تمہارا مطالعہ وسیع ہوگا اور تم کسی بھی موضوع پر آسانی سے لکھ سکو گی۔"

پھر وہ اسے ایک اچھا مضمون لکھنے کا طریقہ سمجھانے لگا۔ سمجھانے سمجھانے میں وہ پورا مضمون لکھ گیا اور وہ کسی فیکٹ اور نصیحت کو خاطر میں لائے بغیر اس بات پر خوش تھی کہ اس کا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ اس کا لکھا مضمون اس نے بڑے اطمینان سے اپنی ہینڈ رائٹنگ میں کاپی کیا اور اگلے روز جب میڈم شیریں نے اس کے مضمون کو بہترین قرار دیا تو وہ فرط سے سینہ چوڑا کر اور گردن تان کر بیٹھ گئی۔ میڈم شیریں جو اچھے انگریزی کی انگریزی میں خامیاں نکالا کرتی تھیں اس کے مضمون کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ اس اسائنمنٹ میں A+ (اے پلس) لے کر وہ بہت خوش تھی۔

کچھ ہی دنوں بعد جب اسے لوسی گرے کا مرکزی خیال لکھنا تھا تو وہ حسن کے پاس چلی آئی۔

"کیا ہوا؟ کوئی کام ہے؟" وہ ایک نظر اس پر ڈال کر دوبارہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"آپ سے ایک کام ہے اگر آپ مصروف نہ ہوں تو؟" وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔ میں مصروف نہیں ہوں۔ بس یہ انسٹالیشن کر رہا تھا۔ اب فارغ ہوں' تم بولو کیا کام ہے۔" جواب میں وہ اپنی کتاب اور ایک پیپر اس کے آگے کرتی ہوئی بولی "آپ مجھے اس پوئم کا مرکزی خیال لکھ دیں۔"

وہ جو اس کی طرف متوجہ تھا' اس کی بات سنتے ہی بڑے بے مروت لہجے میں بولا۔

"سوری۔ میں نہیں لکھ سکتا اور یہ انکار میں اس لیے کر رہا ہوں کہ تم خود اپنے آپ پر بھروسا کرنا سیکھو۔ تم خود لکھو اگر غلط لکھا جائے گا تو کوئی بات نہیں۔ کوئی بھی آدمی ہمیشہ سے پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ سب ہی غلطی کر کے سیکھتے ہیں۔ میرے لکھے ہوئے کی تعریف سن کر تمہیں اتنی خوشی نہیں ہوگی۔ جتنی خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر ہوگی۔ جاؤ شاباش تم خود کوشش کرو۔ اچھا یا برا جیسا بھی لکھا جاتا ہے لکھو اور پھر مجھے لا کر دکھاؤ۔ اگر کوئی غلطی ہوئی تو میں ٹھیک کر دوں گا۔"

وہ دوبارہ مانیٹر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اور وہ اس سے خفا واپس نیچے آ گئی تھی۔ کیا ہو جاتا اگر وہ لکھ دیتا۔ خود کی انگلش ذرا سی اچھی کیا ہے اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ پھر اس نے اماں سے پوچھ پوچھ کر لکھ لیا تھا۔ حسن صبح کا گیا رات کو گھر آتا تو کھانا کھا کر اپنے کمرے میں گھس جاتا تھا۔ اسے تو شاید پتا بھی نہیں چلا تھا کہ وہ اس سے ناراض ہے۔

انٹر کے امتحانوں کے فوراً بعد فرناز کی شادی تھی اور وہ اس میں بڑے زور و شور سے شرکت کر رہی

تھی۔ اماں نے تمام فنکشنز کے لیے اسے نئے جوڑے بنا کر دیے تھے۔

اس روز فرناز کی مایوں تھی۔ وہ پیلے رنگ کا کرتا پاجامہ اور بڑا سا لال اور پیلے رنگ کا چنری کا دوپٹہ اوڑھ کر خوب دل سے تیار ہوئی تھی۔ اس کی تیاری ہوتی بھی کیا تھی؟ اماں کو لڑکیوں کا زیادہ بناؤ سنگھار پسند نہ تھا۔ اس لیے اس کا میک اپ کاجل اور پرفیوم پر مشتمل تھا۔ دونوں ہاتھوں میں بھر بھر کانچ کی چوڑیاں پہنے اور بالوں میں پراندہ ڈالے وہ تیار ہو کر نکلی تو لاؤنج میں حسن بیٹھا کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کا دل عجیب انداز سے دھڑک اٹھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی وہ اپنے اس خود میں مگن اور لاپروا سے کزن کے بارے میں کچھ عرصے سے بڑے مختلف انداز میں سوچنے لگی تھی۔ اپنی یہ سوچیں اسے خود ہی ہراساں کر دیتیں۔ وہ ان کا کسی بات کا خود سے بھی اعتراف کرتے ڈرتی تھی۔ مگر اس وقت وہاں حسن کو بیٹھا دیکھ کر اس کا بے ساختہ دل چاہا کہ وہ ایک ستائشی نگاہ اس کی طرف ڈالے۔ مگر وہ سرسری سے انداز میں اسے دیکھ کر اپنی باتوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس کا دل اس کی بے اعتنائی پر کچھ بجھ سا گیا۔ ابھی اس کیفیت پر وہ خود کو سرزنش کر رہی تھی کہ اماں وہاں آ گئیں اور خوب اس کی بلائیں لیں' باقاعدہ نظر اتاری۔ اس کے بعد حسن سے بولیں۔

"بیٹا! رانی کو چھوڑ آؤ۔" وہ ریسیور رکھ کر اماں کی طرف متوجہ ہوا۔

"کہاں چھوڑنا ہے؟"

"ذکیہ کے گھر اور کہاں؟" اماں کے جواب پر وہ کچھ جھنجلا کر کھڑا ہوا اور بولا۔

"اپنی ہی گلی کے کسی گھر میں یہ اکیلی نہیں جا سکتی۔" پھر اماں کا جواب سنے بغیر سلیپر پاؤں میں ڈالتے ہوئے بے زاری سے بولا "چلو" وہ اس کی بے زاری اور ناراضی پر حیران ہوتی اس کے پیچھے ہو لی۔

اس کے بارے میں ہر فیصلہ اماں ہی کیا کرتی تھیں۔ اس کے کپڑوں جوتوں سے لے کر پڑھائی تک وہ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اماں کی محتاج تھی۔ اسے اپنی پسند پر بالکل بھی بھروسا نہ تھا۔ بازار جا کر اگر اماں کہتیں بھی کہ وہ خود پسند کرے تو وہ بڑی لجاجت سے ان کا بازو تھام کر کہتی۔ "اماں آپ کی پسند زیادہ اچھی ہے آپ چوز کریں۔" اور وہ اسے ٹوکے بغیر خود ہی اس کے لیے تمام چیزیں پسند کرتیں۔

تھرڈ ایئر میں داخلے کا وقت آیا تو چونکہ اس کے کالج میں بی ایس سی کی کلاسیں نہیں ہوتی تھیں' اس لیے اماں نے اسے پی ای سی ایچ ایس کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ مضامین کا انتخاب بھی اماں ہی نے کیا تھا۔ گو کالج آنے جانے کے لیے اسے وین لگوا کر دی گئی تھی مگر وہ پھر بھی بڑی ڈری ہوئی تھی۔ اس سے پہلے اسکول اماں کے ساتھ اور کالج سہیلیوں کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ اب اتنی دور آنا جانا اسے ڈرا رہا تھا۔ کچھ وقت گزرا تو وہ نئے ماحول میں تھوڑی بہت ایڈجسٹ ہو ہی گئی۔

تھرڈ ایئر کے امتحان سر پر تھے اور آج جرنل Certify (چیک) کروانے کی آخری تاریخ تھی۔ وہ بے چینی سے وین کا انتظار کر رہی تھی۔ جب کافی دیر گزر گئی اور وین نہیں آئی تو وہ رونی شکل بنا کر گیٹ بند کرتی لاؤنج میں آ گئی۔ جہاں حسن اخبار پڑھ رہا تھا۔ اماں شاید اس کے لیے ناشتہ بنا رہی تھیں۔ حسن کے آگے ناشتہ رکھتے ہوئے وہ اس سے بولیں۔

"لگتا ہے' تمہارا وین والا آج گول ہو گیا ہے۔"

وہ جواب میں روہانسی آواز میں بولی "آج میرا جانا اتنا ضروری ہے۔ اب میں کیا کروں۔"

اماں اپنی لاڈلی کی آنکھوں میں آنسو کہاں دیکھ سکتی تھیں۔ فوراً حکم صادر فرمایا۔ "حسن! آفس جاتے ہوئے رانی کو کالج ڈراپ کر دینا۔"

اماں کے اس شاہی فرمان پر وہ جل کر رہ گیا آج اسے آفس جلدی پہنچنا تھا۔ اب ان محترمہ کے ساتھ خواری اٹھاؤ۔ وہ بے مزہ ہوا۔ مگر اماں کے حکم سے سرتابی کی مجال بھی نہ تھی اس لیے سر ہلا دیا۔

اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھی وہ تمام قرآنی آیات جو اسے یاد تھیں کا ورد کر رہی تھی۔ وہ بائیک چلا نہیں

بلکہ اڑا رہا تھا۔ اس کے کندھے کو مضبوطی سے جکڑ کر بیٹھی وہ اپنے اگلے پچھلے گناہوں کی معافی مانگ رہی تھی۔ اسے جتنی جلدی تھی۔ اتنی ہی دیر لگ رہی تھی۔ بمشکل آدھا راستہ ہی طے کیا ہو گا کہ بائیک پنکچر ہو گئی۔ وہ بری طرح جھنجلایا ہوا تھا۔ اس کی طرف ایک قہر برساتی نظر ڈال کر وہ بائیک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر بائیک کا بغور معائنہ کر کے وہ اس سے بولا۔

"تم یہیں رکو۔ میں یہ سامنے جو موٹر مکینک ہے' وہاں تک جا رہا ہوں۔"

اس کی طرف دیکھے بغیر وہ بائیک گھسیٹتا ہوا آگے بڑھ گیا اور وہ خوف میں گھری وہیں کھڑی رہ گئی۔ روڈ کے کنارے فٹ پاتھ پر چڑھی وہ خوف و دہشت سے کانپ رہی تھی۔ پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کا خوف زدہ چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"کیا ہوا؟"

جواب میں وہ بڑی گھٹی گھٹی آواز میں بولی

"مجھے اتنا ڈر لگ رہا تھا۔ یہ سامنے جو آدمی کھڑا ہے' اتنی دیر سے یہیں دیکھے جا رہا ہے۔"

اس کی بات پر حسن نے بڑے غصے سے اس طرف دیکھا جہاں وہ اشارا کر رہی تھی تو یہ دیکھ کر سر پیٹ کر رہ گیا کہ وہ بے چارے ایک ضعیف سے آدمی تھے۔ جو شاید روڈ کراس کرنے کے لیے ٹریفک رکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ جو اس خیال سے مڑا تھا کہ کون ہے جو اس کی کزن کو گھور رہا ہے۔ ابھی اس کا دماغ ٹھیک کرتا ہوں اس پر ایک ملامتی نظر ڈال کر ان بڑے میاں کی طرف بڑھ گیا اور روڈ کراس کر کے ان تک پہنچا۔ پھر ان کا ہاتھ تھام کر انہیں روڈ پار کراتا اس کے پاس چلا آیا۔ اس سے کچھ کہنا بے کار محسوس ہوا' اس لیے خاموش ہی رہا اور اسے کالج ڈراپ کر کے خود آفس چلا گیا۔

سامنے والی صبا بھابھی کے ہاں پہلے بچے کی ولادت تھی اور ان کے ساتھ ہاسپٹل جانے والا کوئی نہ تھا۔ اماں اپنی ہمدرد طبیعت سے مجبور ہو کر ان کے ساتھ چلی گئیں اور پھر رات میں فون کر کے کہہ دیا کہ وہ صبح آئیں گی۔ حسن اماں کا پیغام سن کر گھر لاک کر کے اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اماں کے بغیر اکیلے نیچے رہنے کا تصور اس کے لیے بڑا ہی خوفناک تھا۔ کچھ دیر بیٹھی ٹی وی دیکھتی رہی مگر جب ڈر کسی بھی طرح کم نہ ہوا تو بھاگم بھاگ اس کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ پروسیسر کھولے کوئی کام کر رہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر بولا۔

"یقیناً" آپ کو ڈر لگ رہا ہو گا؟"

وہ اس کا طنزیہ انداز نظر انداز کر کے بولی۔ "ہاں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ پلیز کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔ آج آپ نیچے لاؤنج میں سو جائیں۔"

"اور جو مجھے اتنا سارا کام کرنا ہے۔ اس کا کیا ہو گا؟" وہ اپنے کام میں مصروف بولا۔

"پلیز میری خاطر۔" وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

"آپ کی خاطر آفس میں جھڑکیں کھاؤں۔ مجھے بہت کام ہے' جاؤ یہاں سے۔"

وہ بڑی بے زاری سے اس پر ایک نظر ڈال کر دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا' وہ وہیں کھڑی رونے لگی۔ اس کے رونے پر اس نے بڑی کوفت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"چلو نیچے' میں آ رہا ہوں۔"

وہ آنسو صاف کرتی خوشی خوشی نیچے آ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی بڑی ناراض شکل بنائے تکیہ ہاتھ میں اٹھائے نیچے آ گیا اور لاؤنج میں کارپٹ پر تکیہ رکھ کر لیٹ گیا۔

اس کے آنے پر اس نے سکون کا سانس لیا اور پھر لاؤنج اور اپنے کمرے کے درمیان موجود کھڑکی کھول کر خود بھی لیٹ گئی۔ رات میں کئی بار اٹھ کر اس کی موجودگی کا یقین کیا۔ وہ سوتے میں بھی ناراض نظر آ رہا تھا۔

اگلے روز رات میں وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی جب اس نے حسن کی آواز سنی' وہ اماں سے کہہ رہا تھا۔

"آپ کے غیر ضروری لاڈ پیار نے اس کا ستیاناس

کر دیا ہے۔ اتنی بڑی لڑکی بچوں جیسی حرکتیں کرتی ہے۔"

"کوئی نہیں' اتنی پیاری ہے میری بیٹی۔ تم خوامخواہ اس کے دشمن مت بنو۔" اماں نے بیٹے کی بات کو کوئی اہمیت دیے بغیر کہا تو وہ خوش ہو گئی۔

"اماں! میں اس کی دشمنی میں نہیں کہہ رہا۔ ذرا سوچیں آپ یا میں آخر کب تک اس کی انگلی پکڑ کر اسے چلائیں گے۔ میرے بجائے آپ کا رویہ اس کی دشمنی پر مبنی ہے۔ اتنی بڑی گروم اپ لڑکی اکیلے ہونے سے ڈرتی ہے' اس کے خیال سے روڈ پر چلتا ہر دوسرا شخص اسی کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ اکیلی اپنی ہی گلی میں کہیں نہیں جا سکتی۔ آخر اس کا بنے گا کیا۔ اس طرح وہ زندگی کیسے گزار پائے گی؟"

اماں نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔

"تم اس کے غم میں مبتلا مت ہو۔ میری بیٹی جیسی بھی ہے' آج کل کی تیز چالاک لڑکیوں سے بہت بہتر ہے اور اللہ نہ کرے اس کی زندگی میں کوئی ایسے ویسے حالات آئیں۔"

وہ ان کی بات پر منہ بنا کر چپ ہو گیا اور فاطمہ کے دل میں اس کے خلاف گرہ پڑ گئی۔

اس بار وہ بڑی سنجیدگی سے حسن سے ناراض ہوئی تھی۔ آمنا سامنا ہونے پر وہ اسے نظر انداز کرتی اپنا کوئی کام کرنے میں لگی رہتی۔ اول تو وہ گھر پر کتنا ہی کم تھا اور جو تھوڑا بہت وقت وہ گھر پر ہوتا بھی تھا تو اسے اپنے کام دھندوں سے فرصت نہ تھی کہ اس کی ناراضی کے اسباب پر غور کرتا۔ وہ اس کی بے نیازی پر کھول کر رہ جاتی۔ وہ ڈھائی ماہ جاری رہنے والی اس یک طرفہ ناراضی کا اختتام بھی اسے سابقہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے خود ہی کرنا پڑ گیا۔

صبا بھابھی اپنی کسی رشتے دار خاتون کے ساتھ ان کے گھر آئیں اور رازداری میں اماں کو بتایا کہ وہ فاطمہ کے لیے رشتہ لائی ہیں۔ یہ خاتون ان کی کوئی دور کی عزیزہ ہیں اور ان کا بیٹا بی کام کر کے "سوئی سدرن" میں جاب کرتا تھا۔

"میں نے فاطمہ کی خوب تعریفیں کیں تو وہ یہاں آنے کے لیے بے تاب ہو گئیں۔"

اماں بھابھی کی بات پر مسکرا دیں اور بولیں "پہلے مجھ سے پوچھ تو لیتیں۔ اپنی رانی کو تو میں کبھی خود سے جدا نہیں کروں گی۔ وہ ہمیشہ میرے پاس رہے گی۔"

اماں کی بات سمجھتے ہوئے صبا بھابھی بھی ہنس پڑیں اور بولیں "بڑی چالاک ہیں آنٹی آپ۔ چپکے چپکے پسند بھی کر لی اور ہمیں بتایا بھی نہیں۔"

وہ جو چائے لے کر اندر آنے والی تھی' ان لوگوں کی معنی خیز گفتگو سن کر رک گئی۔ یہ تمام باتیں سن کر اسے عجیب سی خوشی ہوئی تھی۔

رات کھانے کے دوران اماں حسن سے بولیں "آج صبا اپنی کسی جاننے والی کے ساتھ فاطمہ کے لیے پروپوزل لائی تھی۔" وہ حسن کے سامنے اس ذکر پر جھینپ گئی۔ حسن نے پانی پیتے ہوئے ایک نظر اس کے شرم سے سرخ پڑتے چہرے پر ڈالی پھر اماں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ شاید ابھی ان کی بات کے جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا۔ کہ فون کی بیل بجنے لگی۔ وہ پہلے ہی وہاں سے اٹھنے کا بہانا تلاش کر رہی تھی۔ فوراً اٹھ گئی۔ اتفاق سے فون تھا بھی اس کا۔ دس منٹ بعد وہ فون سن کر واپس آئی تو دروازے پر ہی رک گئی۔ اندر بات ہی کچھ اس قسم کی ہو رہی تھی۔ حسن اماں سے کہہ رہا تھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اسے صرف اور صرف ایک کزن سمجھتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میری زندگی کی Priorities (ترجیحات) میں شادی سب سے آخری نمبر پر ہے۔ مجھے ابھی اپنا کیریئر بنانا ہے۔ خود کو اسٹیبلش کرنا ہے۔ تب کا کیا خیال ہے۔ ہم ساری زندگی اس جاب پر اکتفا کر کے کنویں کا مینڈک بن کر گزار دوں۔"

اس کے صاف اور دو ٹوک جواب پر اماں کچھ مایوس سی ہو کر بولیں "خالی منگنی یا بات پکی کرنے میں کیا برائی ہے۔ شادی انسان کو ترقی کرنے سے تو نہیں روکتی۔ تمہارے اپنے بابا کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ مجھ سے شادی کے بعد انہوں نے ڈاکٹریٹ کیا اس کے علاوہ بھی وہ ساری زندگی علمی اور تحقیقی کاموں میں مصروف رہے۔ کب میں ان کے راستے کی رکاوٹ بنی۔ بلکہ وہ تو الٹا مجھے اپنی ترقی اور کامیابی کا پچاس فیصد حصہ دار قرار دیتے تھے۔ خود میں نے بھی تو شادی کے بعد تعلیم مکمل کی۔"

"ضروری تو نہیں جو آپ نے کیا' وہ میں بھی کروں اور ویسے بھی میں بابا جتنا جینئس نہیں ہوں۔ میں ایک وقت میں ایک طرف اپنی توجہ رکھ سکتا ہوں۔ مجھے ابھی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ میرے ٹیوچر پلانز مجھے آئندہ پانچ چھ سال تک شادی کی اجازت نہیں دیتے۔"

اس کی بات پر شاید اماں نے کچھ اور بھی کہا ہو مگر وہ سنے بغیر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنے رو کے جانے پر وہ بہت بری طرح انسلٹ محسوس کر رہی تھی۔ مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اماں یا حسن کو اس بات کی خبر ہو کہ وہ ان لوگوں کی باتیں سن چکی ہے اس لیے اس نے اپنا رویہ معمول کے مطابق رکھا۔ حسن سے بھی بڑے عام سے انداز میں بات کرتی۔ گو دل سے وہ اس بات پر سخت شاکی تھی لیکن اسے اپنا بھرم بہت عزیز تھا۔

حسن کو ایک نیشنل میں بہت اچھی پوسٹ آفر ہوئی تو اس نے جوائن کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ پہلے دو تین جگہ ہاتھ پاؤں مار کر وہ جتنا کماتا تھا۔ اب ایک ہی جگہ کام کر کے وہ اس سے بہتر تنخواہ پا رہا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ جانے کی تو اب کوئی ضرورت باقی نہ رہی تھی سو شام اب اس کے پاس فارغ تھی۔ اس فراغت کا فائدہ اٹھا کر اس نے این ای ڈی یونیورسٹی کے ایوننگ پروگرام میں ایم سی ایس میں ایڈمیشن لے لیا۔ اس کے اس اقدام سے اماں سب سے زیادہ خوش ہوئی تھیں۔ بیٹا کامیابیوں کا سفر طے کر رہا تھا' اس کی جاب میں بھی اس کی لیاقت اور ذہانت کے ڈنکے پٹ رہے تھے' ان کا سر فخر سے بلند تھا۔

اماں سیٹلائٹ چینلز اور وی سی آر کی پکی دشمن تھیں' اس لیے اس قسم کی کوئی چیز ان کے گھر موجود نہ تھی۔ اس بارے میں ان کا کہنا تھا "ایک طرف تو ہم لوگ انڈیا کو اپنا سب سے بڑا دشمن کہتے ہیں اور دوسری طرف ان کے ٹی وی پروگرام اور فلمیں دیکھتے ہیں۔ جس کسی کے بھی گھر میں ڈش یا وی سی آر ہے' وہ انڈین پروگراموں کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتا۔ ہمارے قول اور فعل کے اسی تضاد کی وجہ سے ہم آج تک کشمیر آزاد نہیں کروا سکے۔ جب ہم ان سے ثقافتی جنگ ہار گئے تو کسی اور میدان میں کیا لڑ سکیں گے۔"

اس کی دوستیں فلموں وغیرہ کی باتیں کرتیں تو وہ خاموشی سے ان کا منہ دیکھتی رہتی۔

اس روز نغمہ نے اسے ایک انگلش فلم کی سی ڈی دے دی اور بولی۔

"بڑی اچھی موویز ہے۔ اسے دیکھنے سے تو تمہاری اماں بھی منع نہیں کریں گی۔ انہیں تو صرف انڈین فلمیں ناپسند ہیں۔"

اس نے فلم کی بہت تعریف کی تو اس کا بھی دیکھنے کو دل چاہنے لگا۔ چنانچہ اس سے سی ڈی لے لی۔ حسن کی اجازت کے بغیر وہ کمپیوٹر میں گھسنا نہیں چاہتی تھی اور ویسے بھی اسے کمپیوٹر کے بارے میں کچھ معلومات نہ تھیں' اس لیے اس نے اس کی واپسی کا انتظار کیا۔ رات کھانے کے بعد وہ اس کے کمرے میں آئی تو وہ بیڈ پر ٹانگیں پھیلائے کسی سے فون پر محو گفتگو تھا۔

"میں تو بارڈ ویئر انجینئر اسے مانتا ہوں جو کسی چیز کو ری پلیس کرنے کے بجائے ریپئر کرے۔ تم دیکھنا' میں یہ چیلنج جیت جاؤں گا۔ اگر میں نے ہارڈ ڈسک ریپئر نہ کر دی تو میرا نام بدل دینا۔"

وہ بڑے زور و شور سے بلند بانگ دعوے کر رہا تھا۔ اسی وقت اس کی نظر اپنے سامنے کھڑی فاطمہ پر پڑی تو اس نے جلدی جلدی اپنی بات ختم کر کے فون رکھ دیا اور اس سے بولا۔

"کیا بات ہے' کوئی کام ہے؟"

"میں اپنی فرینڈ سے یہ موویز لائی ہوں۔" اس نے سی ڈی اس کے سامنے کی تو وہ ایک لمحے کو تو نہ سمجھنے

والے انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے بعد مسکرا کر بولا۔

"اچھا تو تمہیں کمپیوٹر پر یہ مووی دیکھنی ہے۔"

اس کی بات پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ قدرے افسوس بھرے لہجے میں بولا "لیکن تم دیکھو گی کیسے۔ اصل میں میرے پاس ساؤنڈ کارڈ نہیں ہے۔"

"یہ ساؤنڈ کارڈ کیا بلا ہے۔" وہ جانتی نہ تھی۔ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر وہ بولا۔

"میرا مطلب ہے کہ تم فلم کیسے دیکھو گی۔ آواز کے بغیر کیا مزہ آئے گا؟" وہ اس کے تاثرات سے ہی سمجھ گیا تھا۔ اس لیے فوراً ہی وضاحت کے ساتھ سمجھایا تھا۔ اس کی بات پر وہ کچھ مایوس سی اپنے کمرے میں لوٹ آئی تھی۔ نغمہ نے فلم کے اتنے قصیدے پڑھے تھے کہ اس کا دیکھنے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔

اگلے روز کھانے کی میز پر وہ اس سے بولا "تم نے اپنی دوست کو سی ڈی واپس تو نہیں کی؟"

وہ اس کے سوال پر کچھ حیران ہوتی ہوئی بولی "نہیں۔ آج کل تو چھٹیاں ہیں۔ اب چھٹیوں کے بعد ہی واپس کروں گی۔"

کھانے کے بعد اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اس نے کہا "ایک کپ گرما گرم مزے دار سی چائے کا لے کر جلدی سے میرے کمرے میں آؤ۔"

چائے لے کر وہ اس کے کمرے میں آئی تو وہ کمپیوٹر کی ٹیبل کے سامنے ہی کھڑا ہوا تھا' اسے آتا دیکھ کر بولا۔

"یہ دیکھو۔ بھلا بتاؤ' اسے کیا کہتے ہیں؟" اس نے دو تین ڈبے اس کے سامنے کیے۔ پھر اس کے جواب دینے سے پہلے خود ہی کہنے لگا

"بہت دنوں سے اپنے کمپیوٹر میں ساؤنڈ کارڈ کا اضافہ کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ میں نے سوچا' چلو تمہارا بھی بھلا ہو جائے گا' آج ہی خرید لوں۔"

وہ اس سے باتیں کرتا پروسیسر کی طرف متوجہ ہو گیا اور ایک عجیب الخلقت سی شے اس کے سامنے کرتا ہوا بولا "یہ دیکھو' اسے ساؤنڈ کارڈ کہتے ہیں۔"

وہ خاموشی سے کھڑی اسے ساؤنڈ کارڈ لگاتا دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اس نے مانیٹر کے دائیں بائیں دو اسپیکر رکھے اور پروسیسر میں ان کے تار لگانے لگا۔

"میں سی ڈی لے کر آؤں۔" وہ بڑے مصروف انداز میں بولا "ہاں لے آؤ۔ ویسے ابھی تو میں ساؤنڈ کارڈ Detect (ڈیٹیکٹ) کروا رہا ہوں۔" اس کی بونق شکل پر اس کی نظر پڑی تو ہنستے ہوئے بولا۔

"Detect کا مطلب پتا ہے؟" وہ اپنا مذاق اڑائے جانے پر کچھ ناراض سی ہوئی تو وہ بولا۔

"تم تو میرا نام ڈبواؤ گی۔ اچھا یہ بتاؤ' ہارڈ ویئر کسے کہتے ہیں اور سافٹ ویئر کسے؟" کمپیوٹر میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ سیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے بڑی بے زار سی شکل بنائے کھڑی رہی۔

جبکہ وہ اسے سکھانے پر بضد۔ وہ بہترین کمپیوٹر پروگرامر' ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کی دنیا کا بے تاج بادشاہ۔ پتا نہیں کون کون سی لینگویج جس کے گھر کی باندیاں تھیں۔ اس کی اپنی کزن کا یہ حال اسے چراغ تلے اندھیرے کے مترادف محسوس ہو رہا تھا۔ مگر جب مقابل کچھ سیکھنے پر ہی آمادہ نہ ہو تو پھر فائدہ کیا۔

اس لیے سوال جواب کا پروگرام ملتوی کر کے سی ڈی اس کے ہاتھ سے لے لی اور اسے سمجھانے لگا کہ کیسے کمپیوٹر آن کر کے سی ڈی لگانی ہے۔

"ابھی تو مجھے اپنا کچھ کام کرنا ہے۔ تم کل یہ فلم دیکھ لینا اور اس کے علاوہ بھی کبھی کوئی فلم دیکھنی ہو یا کوئی اور کام ہو تم آرام سے میرا کمپیوٹر استعمال کر سکتی ہو۔"

اس کی عنایتوں پر سرشار سی وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے لگا وہ خاص طور پر اسی کے لیے ساؤنڈ کارڈ وغیرہ لایا ہے' اس کی جانب سے اپنائیت کا یہ اظہار اسے بے طرح خوش کر گیا تھا۔ اس کا خوش فہم دل دوبارہ سے بڑی فضول سی باتیں سوچنے لگا تھا۔

بی ایس سی کرنے کے بعد وہ آرام سے گھر بیٹھ گئی۔ اماں نے ایک آدھ بار سرسری سا اسے آگے پڑھنے

کے لیے کہا مگر اس کا ایسا کوئی ارادہ نہ دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

اسے سارا دن اماں کے ساتھ گھر میں رہنا اور گھر کے کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ کھانا پکانے سے لے کر گھر کے دیگر تمام کاموں تک اس نے اماں سے سارا چارج لے لیا تھا اور انہیں بستر پر بٹھا کر خود سارا دن کاموں میں لگی رہتی۔ اسے اپنا یہ گھر' اماں اور حسن اس کے علاوہ دنیا میں کسی چیز سے مطلب نہ تھا۔ باہر کی دنیا کیسی ہے اور وہاں کیا ہو رہا ہے اسے اس کی کچھ خاص پروا نہ تھی۔ حسن نے ایم سی ایس مکمل کر کے آئی بی اے سے ایم بی اے کرنے کی ٹھانی تو اماں بیٹے کے خلاف دل میں موجود تمام ناراضی بھول گئیں۔

وہ تین روز سے اماں کو بخار تھا۔ طبیعت تو زیادہ خراب نہ تھی۔ مگر پتا نہیں کیا بات تھی' وہ سارا دن انتہائی مایوسی کی باتیں کر کے اسے ہولاتی رہی تھیں۔ کبھی کہتیں "کاش میں اپنی زندگی میں تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جاتی۔"

کبھی کہتیں "کتنی حسرت تھی مجھے اپنی رانی کو دلہن بنا دیکھنے کی۔"

وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہتیں تو وہ سہم کر ان کے ہاتھ تھام لیتی۔

"اماں! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ پلیز ایسے مت کہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

اور وہ جواب میں ایک گہری سی سانس لے کر چپ ہو جاتیں۔

رات کو حسن ان کے کمرے میں ان کا ٹمپریچر چیک کرنے اور دوا دینے آیا تو وہ اس سے بھی اسی طرح کی باتیں کرنے لگیں۔ وہ ان کی باتوں پر ڈری سہمی ان کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر تو حسن ان کی باتیں سنتا رہا پھر بولا۔

"اماں! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ معمولی سا بخار ہے' ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ انہیں تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا تو وہ بے اختیار اس کے ہاتھ تھام کر بولیں۔

"حسن! میرا وقت آ گیا ہے۔ دیکھو' میرے بعد میری بچی کا خیال رکھنا۔ اگر اسے کوئی تکلیف پہنچی تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

ان کی اس بات پر وہ رونے لگی اور زندگی میں پہلی مرتبہ اماں نے اس کے رونے پر کوئی توجہ نہ دی اور بدستور حسن کے ہاتھ پکڑے بولے گئیں۔

"تم مجھ سے وعدہ کرو۔ رانی کا خیال رکھو گے۔ اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑو گے۔ اگر اسے کوئی دکھ پہنچا تو میں روز حشر صفیہ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔" حسن نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن وہ ضدی سے لہجے میں بولیں۔

"نہیں۔ تم مجھ سے وعدہ کرو۔ میں اپنی بچی تمہارے سپرد کر کے جا رہی ہوں۔" پھر اس کے وعدہ کرنے پر انہوں نے گہری طمانیت بھری سانس لی اور بولیں۔

"اپنا وعدہ ایفا کرنا۔ اسے کبھی شرمندہ نہ ہونے دینا۔"

اس رات بھی روز کی طرح وہ ان کے برابر سوئی تھی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو اماں بے خبر سو رہی تھیں۔ روز فجر میں اسے اماں ہی جگایا کرتی تھیں لیکن آج اماں نے نہیں اٹھایا تو وہ آٹھ بجے تک سوتی رہی تھی۔ وہ انہیں آوازیں دے کر اٹھانے لگی۔ اس کے بعد انہیں جھنجھوڑ کر ہلایا مگر وہاں ایک گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔

وہ سراسیمگی کے عالم میں بھاگتی ہوئی حسن کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے حواس باختہ اور پریشان دیکھا تو اس سے کچھ پوچھے بغیر ہی بھاگتا ہوا نیچے آ گیا۔ اماں کو آ کر قریب سے دیکھا۔ دو چار آوازیں دیں اور پھر فوراً ہی قریب ترین کلینک سے ڈاکٹر کو لے کر آ گیا۔ ڈاکٹر نے آ کر ان کے بدترین خدشات کی تصدیق کی تو اس کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ وہ شاید چکرا کر زمین پر گرنے والی تھی جب حسن نے اس کو سنبھالا تھا اور شاید گلے سے لگا کر کچھ کہا بھی تھا مگر وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

تین دن تک وہ آنکھ سے ایک بھی آنسو ٹپکائے بغیر

سکتے کی کیفیت میں رہی۔ سب اسے رلوانے کی کوشش کر چکے تھے مگر وہ چپ چاپ بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ تیسرے دن ذکیہ آنٹی اس کے پاس آئیں اور اس کے بالوں میں بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"بیٹا! تم نے اتنے دنوں سے کچھ کھایا نہیں ہے۔ لو یہ ذرا سا دودھ پی لو۔" وہ دودھ کا گلاس اس کے آگے کرتے ہوئے بولیں تو اس کی سوئی ہوئی حسیات بیدار ہو گئیں۔ اماں اسے زبردستی دودھ پلا رہی تھیں اور وہ پینے میں نخرے دکھا رہی تھی۔ کوئی منظر اس کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگا تو وہ گلاس ان کے ہاتھ سے جھٹکتے ہوئے چیخ کر بولی۔

"میری اماں کہاں ہیں۔ میں دودھ ان کے ہاتھ سے پیتی ہوں۔ آپ کو پتا نہیں ہے کیا؟" وہ دیوانہ وار اٹھ کر بھاگی اور اپنے کمرے میں آکر آوازیں دینے لگی۔

"اماں! کہاں ہیں آپ' جلدی آئیں۔" اس کی اس حالت پر سب ہی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں جبکہ وہ اب چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔

"میری اماں کو لاؤ۔ میں سوؤں گی کس کے پاس' مجھے اب پیار کون کرے گا' مجھے رات کو دودھ کون پلائے گا۔"

پھر جو وہ روئی تو اپنے ساتھ سب ہی کو رلا گئی تھی۔ حسن دروازے میں کھڑا نم آنکھوں سے اسے روتا بلکتا دیکھ رہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

صبح نو بجے وہ سو کر اٹھا۔ نہا کر کمرے سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ اسے رات جس جگہ اور جس زاویہ سے بیٹھا چھوڑ کر گیا تھا وہ ابھی تک اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے قدموں کی چاپ پر فاطمہ نے نظریں گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"تو تم رات بھر یہیں بیٹھی رہی ہو۔ اوہ مائی گاڈ!" وہ پریشانی سے بولا۔ کچھ دیر اس کے چہرے کو بغور جانچتا رہا پھر دوبارہ بولا۔

"جاؤ منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ میں ناشتہ لگاتا ہوں۔"

وہ کسی روبوٹ کی طرح اٹھی اور منہ دھونے چلی گئی۔ واپس آئی تو وہ ٹیبل پر بیٹھا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اس کے لیے سلائس پر مکھن لگا کر دیا جسے اس نے خاموشی سے پکڑ لیا۔ وہ اس کے اجڑے اور ویران چہرے سے نظریں ہٹا کر بڑے عام سے انداز میں بولا۔

"لگتا ہے' رات بھر تم نے کوئی پیکنگ کی نہیں ہے۔ اب ایسا کرو ناشتے کے بعد اپنے کپڑے وغیرہ اور جو ضروری چیزیں ہیں انہیں پیک کرو۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تمہیں بھی تین چار گھنٹے تو لگیں گے ہی۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے یہیں رہنا ہے۔" وہ بے چین ہو کر بولی۔

"فاطمہ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم اب یہاں نہیں رہ سکتیں۔" وہ نرمی سے بولا۔

"کیوں نہیں رہ سکتی۔ یہ میرا گھر ہے۔ مجھے یہاں سے کون نکال سکتا ہے۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"کوئی تمہیں نکال نہیں رہا۔ بھئی' لوگ کسی وجہ سے اپنا گھر چھوڑ کر ہوسٹل میں نہیں رہتے کیا؟۔ کتنی ساری لڑکیاں پڑھنے کے لیے یا نوکری کے لیے دوسرے شہروں میں آکر ہوسٹلز میں رہتی ہیں۔ وہ بھی تو اپنا گھر چھوڑ کر آتی ہیں۔" وہ بڑے پیار سے اسے سمجھا رہا تھا مگر وہ ایسی کوئی بات سمجھنا نہیں چاہتی تھی اس لیے سابقہ ٹون برقرار رکھتے ہوئے بولی۔

"میں ان کی طرح نہیں ہوں۔ مجھے اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جانا۔"

"میں جب تک آؤں۔ تم سامان پیک کر لینا۔ اب مزید میں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ زچ ہو گیا تو تمام لحاظ اور مروت بالائے طاق رکھتا درشتی سے کہہ کر گھر سے چلا گیا۔ اس سے تو تین چار گھنٹوں کا کہہ کر گیا تھا مگر پریشانی میں ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی واپس آ گیا۔ اس کے کمرے میں آکر دیکھا تو وہ آنسو برساتی سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھ رہی تھی۔ اس وقت کسی بھی قسم کی نرمی یا محبت کا اظہار اسے

مہنگا پڑ سکتا تھا' اس لیے اس کے رونے کی پروا کیے بغیر بولا۔

"میں اپنے کمرے میں ہوں۔ پیکنگ ہو جائے تو مجھے بتا دینا۔"

شام کے چار بجے وہ اس کے ساتھ باہر نکلی تو اس کا دل چاہا' ایک بار اس گھر کی دیواروں سے لپٹ کر خوب روئے۔ اپنے کمرے' لاؤنج' کچن اور گھر کے ایک ایک کونے کو حسرت سے دیکھتی وہ اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ حسن کو آفس کی طرف سے گاڑی ملی ہوئی تھی۔ مگر آفس آنے جانے کے علاوہ وہ اسے استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس لیے باہر کھڑی پیلو کیب میں اس کا سامان رکھنے لگا۔ جب تک ٹیکسی گلی سے نکل نہیں گئی' وہ گردن موڑے اپنے گھر کو دیکھتی رہی۔ وہ اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے حسن کی آواز سنی' وہ کہہ رہا تھا۔

"جعفر کی دور پرے کی رشتے دار ہیں مسز کاظمی۔ بہت اچھا اور صاف ستھرا ہاسٹل ہے۔ گھر میں تو تم بور ہوتی تھیں' وہاں اتنی ساری لڑکیاں ہوں گی۔ تمہیں اتنی اچھی کمپنی ملے گی' دیکھنا تھوڑے ہی دنوں بعد مجھ سے کہو گی میرا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔" وہ اسے بہلا رہا تھا اور فاطمہ اپنے آنسو پیتی چپ بیٹھی تھی۔

گلستان جوہر کے صاف ستھرے علاقے میں واقع وہ ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ وہ حسن کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ سامنے کار پارکنگ اور اس کے ساتھ ہی لان تھا' جس میں دیدہ زیب پھول پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اصل عمارت اس کے پیچھے تھی۔ وہاں کے انٹیریئر پر بہت محنت کی گئی تھی۔ کوریڈور میں انڈور پلانٹس اور خوبصورت پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ مسز کاظمی کے شاندار آفس میں ان کی میز کے سامنے وہ حسن کے برابر والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"آنٹی! یہ میری کزن ہے فاطمہ عارف۔ اور اب آپ کو اس کا خیال رکھنا ہے۔" وہ سامنے بیٹھی ساٹھ پینسٹھ سالہ گریس فل سی خاتون سے مخاطب تھا۔

"تم فکر مت کرو۔ میں اپنے ہاں موجود تمام بچیوں کو اپنی بیٹیوں ہی کی طرح سمجھتی ہوں۔"

وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے اور وہ چپ بیٹھی میز کو گھور رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر جانے لگا تو وہ بھی بے ساختہ کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو؟" مسز کاظمی نے اسے بڑے پیار سے ٹوکا اور پھر حسن سے بولیں۔

"تم کیوں رک گئے؟ جاؤ۔ یہ یہاں بالکل محفوظ ہے۔" وہ جو اسے اٹھتا دیکھ کر رک گیا تھا۔ انہیں خدا حافظ کہتا وہاں سے چلا گیا۔ اسے ایسا لگا' وہ بھری دنیا میں اکیلی کھڑی ہے۔ بالکل تنہا اس کا کوئی نہیں ہے۔

مسز کاظمی پتا نہیں کتنی دیر تک اسے اپنے پاس بٹھائے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ یہ اسپیشل سلوک شاید جعفر کی دوستی کی وجہ سے تھا۔ وہ ان کی کوئی بھی بات نہیں سن رہی تھی۔ وہ خود اسے لے کر فرسٹ فلور پر آئیں اور ایک کمرے کا دروازہ کھول کر بولیں۔

"یہ ہے تمہارا کمرہ۔" پھر کمرے میں موجود ایک لڑکی سے بولیں "ہوریہ! یہ فاطمہ ہے اور اب یہ تمہارے ساتھ اس روم کو شیئر کرے گی۔"

اس لڑکی نے مسکرا کر اسے ہیلو کہا۔ اسے کمرے میں بٹھا کر مسز کاظمی چلی گئیں۔ تو وہ لڑکی بڑی دوستانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے اس سے پوچھنے لگی۔

"چائے پیو گی؟" پھر خود ہی کہنے لگی۔ "بھئی' آج تمہارا پہلا دن ہے اس لیے تم میری مہمان ہو اور ہو سکتا ہے' تم تکلف میں منع کر دو۔ اس لیے میں چائے لے ہی آئی ہوں۔"

پھر چائے پینے کے دوران اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس نے Mass Communication (ابلاغ عامہ) میں ماسٹرز کر رکھا ہے اور آج کل ایک انگریزی روزنامے کی میگزین انچارج ہے۔ وہ یہاں کیوں رہ رہی ہے یا اس کا گھر کہاں ہے' اس بارے میں اس نے کچھ نہیں بتایا اور وہ تو اس وقت پتا نہیں

بیٹھی ہوئی کیسے تھی۔ اس لیے اس کی تمام باتیں بڑی غیر دلچسپی سے سن رہی تھی۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ اپنے بارے میں سب بتا کر اس نے اس سے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا تھا یا شاید وہ اس کے خود سے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ چائے پی کر وہ اس سے معذرت کرتے ہوئے بولی۔

"میں تمہیں کمپنی دیتی۔ لیکن مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ انشاءاللہ واپسی پر ڈھیروں باتیں ہوں گی۔"

اس کے جانے کے بعد وہ تھکے تھکے انداز میں بستر پر گر گئی۔ کمرہ خاصا کھلا اور ہوادار تھا۔ دو سنگل بیڈز جن کے درمیان میں ایک چھوٹی سی خوبصورت میز رکھی ہوئی تھی۔ سامنے ایک صوفہ تھا۔ کارنر پر رائٹنگ ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ سامنے بڑی سی لکڑی کی الماری تھی۔ اچھے قیمتی کپڑے کے پردے کھڑکیوں پر پڑے تھے۔ وہ وہاں کی خوابصورتیوں سے بے نیاز اپنی حرماں نصیبی پر ماتم کر رہی تھی۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔

وہ روتے روتے پتا نہیں کب سو گئی تھی۔

صبح اس کی آنکھ جویریہ کے جگانے پر کھلی' وہ اس کے پاس کھڑی کہہ رہی تھی۔

"فاطمہ! تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔ نیچے وزیٹرز روم میں۔" اس کی بات سن کر وہ اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی اور پھر نیچے آگئی۔ وہاں کی دیگر جگہوں کی طرح وزیٹرز روم بھی خاصا بڑا اور ویل ڈیکوریٹڈ تھا۔ سامنے صوفے پر حسن بیٹھا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

"کیسی ہو؟" وہ سلام کر کے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تو اس نے اس کے روئے روئے چہرے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ اس کے علاوہ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ اس کے مایوسی بھرے انداز پر وہ اٹھ کر اس کے برابر میں آکر بیٹھ گیا اور نرم لہجے میں کہنے لگا۔

"تم پلیز' اپنے اندر تھوڑی ہمت پیدا کرو۔ اتنی مایوسی اچھی بات نہیں ہے۔ اور پھر تم اکیلی تو نہیں ہو' میں ہوں ناں۔" اس کی اس بات پر وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں' میں اکیلی تو نہیں ہوں۔ تمام رشتے گنوا کر بھی ابھی یہ ایک واحد خونی رشتہ تو میرے پاس ہے۔ یہ میرا اپنا ہے' میرا غم گسار۔ میں اتنی دل گرفتہ کیوں ہو رہی ہوں۔" اپنے رات بھر کے مایوس کن خیالات اس نے لمحے بھر میں رو کر بہا دیے اور قدرے پرسکون ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے مطمئن انداز پر پرسکون ہوتا ہوا بولا۔

"کل تو جلدی میں تم سے ساری باتیں بھی نہیں کر سکا تھا۔ یہ میرا آفس کا فون نمبر ہے۔ کوئی بات ہو کوئی مسئلہ ہو' فوراً مجھے فون کر دینا۔ میں خود بھی چکر لگاتا رہوں گا۔" اس نے ایک چٹ پر دو تین نمبر لکھ کر اسے تھمائے۔ اس نے خاموشی سے وہ چٹ لے لی۔

"یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہونے لگیں گے تو میں تمہیں فارم لا دوں گا۔ بس تم پریشان مت ہونا۔"

وہ دوبارہ اسے تسلی دینے لگا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اسے کچھ نوٹ تھمائے۔ "یہ پیسے رکھ لو اور کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتاؤ؟"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پیسے لے لیے۔

کل کے مقابلے میں آج وہ خود کو خاصا بہتر محسوس کر رہی تھی۔ ہاسٹل میں آہستہ آہستہ سناٹا پھیلتا جا رہا تھا۔

تر ہم لڑکیاں اور خواتین اپنے اپنے تعلیمی اداروں یا آفسز جا چکی تھیں۔

مسز کاظمی مقامی گرلز کالج کی ریٹائرڈ پرنسپل تھیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اکیلا گھر انہیں کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا کہ ان کے تینوں بیٹے امریکہ کی مختلف ریاستوں میں پڑھنے کی غرض سے جانے کے بعد اب مستقل وہیں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی اور ان کے شوہر خاصے اثر و رسوخ والے آدمی تھے' چنانچہ انہوں نے دو سال پیشتر اس گرلز ہاسٹل کا آغاز کیا۔ اس ہاسٹل کی تعمیر اور تزئین و آرائش میں انہوں نے خاصا پیسہ صرف کیا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر ان کے آفس کے علاوہ اکاؤنٹس سیکشن اور دیگر انتظامی دفاتر کے علاوہ رہائشی کمرے بھی تھے۔ تینوں فلورز کے اپنے اپنے ڈائننگ ہالز اور سٹنگ رومز تھے۔ سٹنگ روم میں موجود ٹی وی پر غیر ملکی چینلز بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ وہیں بڑا سا بک شیلف موجود تھا جس میں مختلف اخبارات اور میگزینز رکھے رہتے تھے۔ لڑکیوں کا زیادہ وقت رات میں وہیں گزرا کرتا تھا۔

ہر فلور پر ایک کچن بھی تھا۔ تینوں وقت ناشتہ اور کھانا بھی عمدہ اور معیاری ہوتا۔ لڑکیاں چاہتیں تو ڈائننگ روم میں کھانا کھاتیں نہ چاہتیں تو اپنے کمرے میں منگوا سکتی تھیں۔ روزانہ کمرے کی صفائی اور باتھ روم دھونے کے لیے ماسی بغیر ناغے کے آتی۔ باتھ رومز بھی صاف ستھرے ٹائلز اور ٹب والے تھے۔ اتنی ساری سہولیات وہ ایسے ہی تو فراہم نہیں کر رہی تھیں' وہاں کے چار جز عام ہوسٹلز کے مقابلے میں کافی زیادہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں رہائش پذیر لڑکیاں اور خواتین اچھے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ مسز کاظمی کا گھر ہاسٹل کے برابر میں ہی تھا۔ اس لیے وہ کچھ وقت یہاں اور کچھ اپنے گھر میں گزارا کرتیں۔

ان کی غیر موجودگی میں مسز ہاشمی وہاں کی انچارج بن جاتیں۔ دونوں خواتین وہاں رہنے والی لڑکیوں پر کڑی نگاہ رکھا کرتیں۔ رات نو بجے کے بعد کہیں بھی آنے جانے پر پابندی تھی اور اگر کبھی کسی کو کسی وجہ سے نہیں جانا ہوتا تو کیا' کب' کیوں' کیسے قسم کے ڈھیروں سوالات کا سامنا کرنا پڑتا۔ مسز کاظمی کا شعبۂ جاسوسی خاصا اچھا تھا۔ کسی لڑکی سے اس کے گارجینز کے علاوہ کوئی اور ملنے آتا تو انہیں پتا نہیں کیسے معلوم ہو جاتا اور پھر اس بے چاری کی شامت آجاتی۔ یہ سختی خاص طور پر ان لڑکیوں کے ساتھ تھی جو یہاں پڑھائی کی وجہ سے رہ رہی تھیں۔ ملازمت پیشہ یا بڑی عمر کی خواتین ان کے سوال جواب سے پھر کچھ بچی رہتی تھیں۔ ان کی ان تمام سختیوں ہی کی وجہ سے ان کے ادارے کی ریپوٹیشن بہت اچھی تھی۔ والدین دوسرے شہروں سے اپنی بیٹیوں کو یہاں بھیج کر مطمئن تھے۔

اسے یہاں رہتے تین مہینے ہونے والے تھے۔ وہ صبح میں اکیلی ہوتی تو اپنا سارا وقت قرآن پڑھنے یا تسبیح کرنے میں گزار دیتی۔ سب کچھ پڑھ کر اماں کی روح کو ایصال ثواب پہنچا کر اسے خاصا سکون ملتا تھا۔ حسن ہر اتوار اس کے پاس آتا تو ساتھ ڈھیر ساری چیزیں بھی ہوتیں۔ کبھی اس کی پسند کی کوئی کھانے پینے کی چیز' کبھی کوئی کتاب یا میگزین۔ اسے وہ چیزیں دے کر دس پندرہ منٹ اس کے پاس بیٹھتا اور پھر چلا جاتا۔ ہر مہینے وہ اسے پہلی تاریخ کو تین ہزار روپے دیا کرتا اور ساتھ ہی اس سے یہ بھی پوچھتا۔ "کچھ اور تو نہیں چاہیے؟" اس کی ضروریات ہی کیا تھیں' چنانچہ وہ انکار کر دیتی۔ اپنے آپ کو اس نئے ماحول میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرنے کے باوجود ہر رات اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔ اسے اپنا گھر اور اماں بے طرح یاد آتے۔ ایسے میں جویریہ اس لڑکی کو بڑے دکھ سے دیکھا کرتی جس نے اسے اپنے بارے میں یہ بتایا تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور ساری دنیا میں اس کا اپنے ایک کزن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اب تو اس ایک جیسی روٹین سے بیزار ہو کر وہ بھی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

رات اس نے خواب میں اماں کو اور اپنے گھر کو دیکھا تھا اور اب سو کر اٹھنے کے بعد سے اس کی عجیب حالت تھی۔ ایک بے کلی سی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اڑ کر اپنے گھر چلی جائے۔ وہاں کے ایک ایک کونے کو چومے' اماں کی خوشبو محسوس کرے۔ وہ اپنی اس خواہش کو دبا نہیں پا رہی تھی۔ چھٹی کا دن تھا' جویریہ ناشتے کے بعد اپنی کسی دوست کے گھر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

"جویریہ! تمہاری دوست کا گھر کہاں ہے؟" وہ اسے تیار ہوتا دیکھ کر پوچھنے لگی تو اس نے لپ اسٹک

لگاتے ہوئے جواب دیا۔
"گلبرگ کی سائیڈ پر ہے۔ کیوں؟"
"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ مجھے اپنے گھر جانا ہے۔" وہ ایک دم بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے گردن ہلانے کی دیر تھی' وہ جلدی سے کپڑے بدل کر تیار ہو گئی۔ رکشے میں بیٹھی وہ اپنے گھر پہنچنے کی خوشی میں جویریہ سے اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی تھی۔ وہ اس کا جوش و خروش دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ اسے اس کے گھر کے سامنے اتار کر ہاتھ ہلاتی' اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی تو اس نے بیل بجانے کے ساتھ گیٹ بھی خوب زور زور سے پیٹا۔ دن کے بارہ بج رہے تھے۔ سورج خوب آگ برسا رہا تھا مگر اسے موسم کی تپش یا دھوپ ہرگز بھی پریشان نہیں کر رہی تھی۔

کتنی دیر تک بیل بجانے کے بعد بھی جب گیٹ نہ کھلا تو اس نے بیل پر ہاتھ رکھ کر اسے مسلسل بجنے دیا۔ اسی وقت گیٹ کھلا۔ نیند سے بوجھل سرخ آنکھوں سے جماہی روکتا وہ پتا نہیں گیٹ پر کس کی موجودگی کی توقع کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔
"تم!" حیرانی میں اس کے منہ سے صرف یہی نکل سکا۔ وہ اس کی حیرت سے بے نیاز اپنے گھر کے درودیوار کو محبت سے تک رہی تھی۔
"اکیلی آئی ہو؟" وہ اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیتا ہوا بولا تو اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔
"نہیں۔ جویریہ' میری روم میٹ مجھے یہاں چھوڑ کر گئی ہے۔" اسے جواب دیتی وہ اس سے پہلے ہی اندر آ گئی۔ تو اندر خالی گھر کو دیکھ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"گھر کا سارا سامان کہاں گیا؟" لاؤنج پورا خالی پڑا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم میں بھی سارا فرنیچر غائب تھا۔
"میں نے گھر بیچ دیا ہے۔ پندرہ تاریخ کو نئے لوگ یہاں آ جائیں گے۔"
اس کی بات پر وہ صدمے سے گنگ رہ گئی۔ اس کا پیارا گھر بک گیا تھا اور وہ اس بات سے لاعلم تھی۔ اس نے یہ بات اسے بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی تھی۔ اب وہ ساری دنیا میں کس جگہ کو اپنا گھر کہے گی۔
وہ اس کے تاثرات سے بے نیاز کہنے لگا۔
"تم بیٹھو۔ میں ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں۔ ویسے اس وقت تمہارا آنا فائدہ مند ثابت ہو گیا ورنہ میں پتا نہیں کب تک پڑا سوتا رہتا۔" اس کے جانے کے بعد وہ وہاں موجود واحد کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ دل ہی دل میں اس سے ناراض ہو رہی تھی' "کتنی آسانی سے تم نے ہمارے اس آشیانے کو بیچ دیا۔ تمہیں اس سے کوئی انسیت' کوئی محبت نہ تھی۔" وہ منہ دھو کر واپس آیا تو ہاتھ میں ایک کرسی بھی تھی۔ کرسی اس کے سامنے رکھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔
"مجھے پیسوں کی ضرورت تھی اور پھر فی الحال یہ گھر میری ضرورت کے لیے بہت زیادہ تھا۔ اس لیے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ اس کا اپارٹمنٹ شیئر کروں گا۔ وہاں شفٹ ہو جاؤں تو تمہیں وہاں کا ایڈریس اور فون نمبر بھی دے دوں گا۔ اچھا یہ بتاؤ' تم چائے پیو گی؟"
پھر اس کے جواب دینے سے پہلے ہی اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی گھر کے درودیوار کو تکتی رہی۔
چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں پکڑا کر وہ خود بھی اس کے سامنے بیٹھ کر چائے کے سپ لینے لگا۔ اس کے جلدی جلدی چائے پینے کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے کہیں جانا ہے۔ اس سے مزید کوئی بات کیے بغیر وہ چائے پی کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔
"میں کپڑے تبدیل کر کے ابھی آتا ہوں۔" وہ اس کے عجلت بھرے انداز پر کچھ بے مزہ سی ہو گئی تھی۔ اس کا تو خیال تھا کہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو جائے گا۔ وہ دونوں ڈھیر ساری باتیں کریں گے اپنی اور اماں کی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اسے کھانا پکا کر کھلائے گی۔ مگر وہ اس کے تمام اندازوں کو غلط ثابت کر رہا تھا۔
کپڑے بدل کر واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پیسے پکڑاتا ہوا بولا۔

"تین دن سے آنے کا سوچ رہا تھا۔ مگر ٹائم ہی نہیں مل رہا تھا۔ آج شام میں میرا تمہارے پاس آنے کا پکا پروگرام تھا۔"

اس کی اس بات پر فاطمہ کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ وہ اس کے آنے کی کتنی غلط وجہ سمجھ رہا تھا۔ اس نے تو آتے وقت اس بات پر غور بھی نہیں کیا تھا کہ آج چار تاریخ ہے۔ وہ تو اپنے گھر کی محبت میں دوڑی چلی آئی تھی۔ اس وقت وہ خود اپنی ہی نظروں میں گر رہی تھی۔ کیا وہ اتنی کمینی تھی یا اتنی حقیر کہ یوں پیسے مانگنے اس کے در پر چلی آئی تھی۔ ساری زندگی اسی کے دیے پیسے استعمال کیے تھے۔ گو اسے جیب خرچ وغیرہ اماں دیا کرتی تھیں مگر وہ کمائی تو اسی کی ہوتی تھی۔ آج سے پہلے اس نے وہ پیسے اپنا حق سمجھ کر وصول کیے تھے۔ لیکن آج ہاتھ پر دھرے وہ ہزار ہزار کے تین نوٹ اسے زہریلے سانپ لگ رہے تھے۔ جو اسے ڈسنے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اسے شاید کہیں جانے کی بہت ہی جلدی تھی اس لیے پیسے اسے پکڑا کر وہ دوبارہ کمرے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو کلائی پر گھڑی باندھتا اس سے بولا۔

"چلو میں تمہیں چھوڑتا ہوا چلا جاؤں گا۔" اسے شاید اس کی اجڑی ویران حالت نظر ہی نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے باہر چلی آئی۔ آتے وقت والا جوش و خروش مفقود تھا۔ واپسی میں اس نے ایک الوداعی نظر بھی اس گھر پر نہ ڈالی۔ جسے وہ آج تک اپنا سمجھتی رہی تھی۔ اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھی وہ کسی صدمے کے زیرِ اثر ماحول سے بالکل کٹی ہوئی تھی۔ راستے میں بائیک روک کر اس نے بیکری سے اس کی پسندیدہ کیھل کر کیچ پیک کروائی۔ اس کے بعد ایوانِ شیریں سے رس ملائی خریدی۔ جو کسی زمانے میں اس کی من پسند ہوا کرتی تھی۔ بائیک ہاسٹل کے سامنے روک کر اس نے دونوں تھیلیاں اس کے ہاتھ میں پکڑائیں اور بڑی عجلت میں خدا حافظ کہتا ہوا چلا گیا۔ وہ اپنے وجود کو بمشکل گھسیٹتی کمرے تک آئی۔

"بہت اچھا کیا حسن عباس! جو تم نے مجھے میری اوقات یاد دلادی۔"

وہ صوفے پر دونوں ہاتھ لٹکائے یوں بیٹھی تھی جیسے اپنا سب کچھ گنوا چکی ہو۔ وہ کمزور تھی، بزدل تھی مگر احساسِ کمتری کا شکار نہیں تھی۔

"اماں کے منہ سے خود کو رانی کہلوا کر میں اپنے آپ کو سچ مچ کی رانی سمجھنے لگی تھی۔ کیا ہوں میں ایک شرابی اور جواری کی بیٹی۔ جس کی ماں محلے والوں کے کپڑے سی سی کر اپنا اور میرا پیٹ پالا کرتی تھی اور جسے اس کی اماں ترس کھا کر اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ بے آسرا اور لاوارث سمجھ کر اپنے گھر پناہ دے دی تھی۔ ایک ایسی رشتے دار جس کا نہ کوئی اسٹیٹس تھا اور نہ اسٹینڈرڈ۔ جسے اپنی کزن بتاتے بھی شاید تمہیں شرمندگی ہوتی ہوگی اور اب محض اپنی اماں سے کیے وعدے کی پاداش میں تم اس زبردستی کے رشتے کو نبھانے پر مجبور ہو۔"

اپنی اصلیت اس پر زندگی میں پہلی بار آشکار ہوئی تھی اور خود اپنے ہی لیے یہ سب کچھ سوچنا اسے نہایت اذیت ناک لگ رہا تھا۔

"تمہارے گھر میں رہتے رہتے میں اسے اپنا گھر سمجھنے لگی تھی۔ مجھے اپنا وہ نواب شاہ کا گندا میلا، بوسیدہ مکان بھول گیا تھا۔ خود کو تمہارے برابر سمجھنے لگی تھی۔ کیا ہے میری اوقات؟ تمہارے ٹکڑوں پر پلی، تمہارے در پر پڑی ایک بھکارن جسے تم آج بھی اپنی محنت کی کمائی میں سے خیرات دینے پر مجبور ہو۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ کافی دیر رونے کے بعد جب اس کا دل ذرا ہلکا ہوا تو اپنے آنسو بے دردی سے صاف کرتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں دوبارہ اسے مخاطب کیا۔

"لیکن ایک بات تو تم بھول گئے حسن عباس! جس ہستی نے تمہیں عزتِ نفس، غیرت اور خودی کے معنی سمجھائے تھے۔ میری تربیت بھی انہیں ہاتھوں میں ہوئی ہے اور اب جب کہ میں خوابِ غفلت سے جاگ چکی ہوں، تمہیں بتادوں گی میں اتنی بے غیرت بھی نہیں جتنا تم مجھے سمجھتے ہو۔"

وہ ایک عزم اور نئے حوصلے سے کھڑی ہو گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اگلے روز شام میں چائے پیتے جب اس نے جویریہ سے کوئی جاب دلوانے کی بات کی تو وہ حیران ہو کر کہنے لگی۔

"تمہیں تو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا تھا۔"

"ہاں۔ لیکن اب میرا ارادہ بدل گیا ہے۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔ وہ کچھ دیر اسے حیرت سے دیکھتی رہی پھر کچھ اور پوچھے بغیر کہنے لگی۔

"تمہاری کوالیفکیشن کیا ہے؟"

"میں نے بی ایس سی کیا ہے۔"

"کچھ کمپیوٹر کے بارے میں نالج ہے۔" اس کے جواب پر کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا۔

اس نے جواب میں بڑی شرمندگی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا تو وہ فوراً بولی "آج کل تو معمولی سے معمولی نوکری کے لیے بھی کمپیوٹر لازمی چیز ہے۔ خالی خولی بی ایس سی پر تو تمہیں کسی اسکول ہی میں جاب مل سکتی ہے۔"

وہ اس کی صاف گوئی پر کچھ مایوس سی ہو گئی تو وہ اس کی افسردگی محسوس کر کے کہنے لگی۔

"تم ایسا کیوں نہیں کر لیتیں کسی انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن لے لو۔ آج کل تو جگہ جگہ کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ کھلے ہوئے ہیں اور جاب کی اگر فوری ضرورت ہے تو اس دوران کسی اسکول میں ملازمت کر لو۔ بعد میں جب تم کمپیوٹر کورس کر لو گی تو کہیں بہتر ملازمت کے لیے کوشش کرنا۔"

وہ اس کی اس بات پر کچھ مطمئن ہو گئی اور سوچا "ہاں یہ بہت بہتر ہے۔ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے۔"

اسے ذرا ذرا سی بات کے لیے جویریہ کو پریشان کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر یہ بھی معلوم تھا، کسی اسکول میں ملازمت تلاش کرنا بھی اس کے لیے بڑا مشکل کام ہے۔ مگر اس کے کچھ کہے بغیر جویریہ نے اگلے روز خود ہی اسے یہیں قریب ہی واقع ایک اسکول کے بارے میں بتایا۔

"ہے تو چھوٹا سا اسکول، لیکن میرا خیال ہے، تمہیں سوٹ کرے گا۔ پیدل چلی جایا کرنا۔"

وہ شاید اس کے ڈرپوک پن سے واقف ہو چکی تھی اس لیے خود ہی اس کے ساتھ اسکول گئی۔ وہ اس کی بے حد ممنون ہو رہی تھی۔ آج کے خود غرض زمانے میں وہ لڑکی اس کی کون لگتی تھی جو اپنے قیمتی وقت میں اس کے لیے ٹائم نکال رہی تھی۔ اسے ملازمت مل جانے کی کوئی خاص امید نہ تھی مگر قدرت یہاں اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ ڈھائی ہزار روپے ماہوار اس منہگائی کے دور میں اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات تھی مگر وہ پھر بھی خوش تھی۔ اسے دوسری شفٹ میں سکس اور سیونتھ کلاسز کو سائنس اور میتھس پڑھانا تھا۔

اتفاق سے اسی شام حسن اس سے ملنے آ گیا۔ ماسی اسے پیغام دے کر جا چکی تھی اور وہ زندگی میں پہلی بار اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر پھر زبردستی خود کو سمجھا کر اس کے سامنے آئی، وہ صوفے پر بیٹھا اسی کی راہ تک رہا تھا۔

"کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے نامحسوس انداز میں جواب دیا۔ اور اس کے سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئی، وہ اپنے کسی بھی انداز سے کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"یہ لو۔" اس نے ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں پکڑایا۔ اس پر بڑا بڑا لکھا "یونیورسٹی آف کراچی" دیکھ کر ہی وہ سمجھ گئی کہ اس میں کیا ہے۔ اس کا خوامخواہ ہنسنے کا دل چاہنے لگا۔ وہ اس کی کیفیت سے بے خبر کہہ رہا تھا۔

"تم اسے فل کر کے رکھنا۔ میں کل یا پرسوں آ کر لے جاؤں گا۔ اپنی مارکس شیٹ وغیرہ بھی مجھے دے دینا، میں خود ہی فوٹو کاپی کروا کر اس میں اٹیچ کر دوں گا۔"

اس نے لفافہ نہیں پکڑا "میرا ایڈمیشن لینے کا موڈ نہیں بن رہا۔ اصل میں ڈیڑھ دو سال سے پڑھائی اور کتابوں سے دور ہوں۔ اب دوبارہ پڑھنے کا دل نہیں چاہ رہا۔ اس لیے میں نے یہیں قریب ایک اسکول میں

جاب کرلی ہے اگلے ہفتے جوائن کرلوں گی۔"

وہ اس کے پراعتماد انداز پر کچھ دیر سکتے کی کیفیت میں اسے دیکھتا رہا۔ جیسے اس بات پر یقین کرنے میں اسے تامل ہو۔

"اسکول میں جاب۔۔۔؟" اس نے کچھ دیر بعد بڑی بے یقینی سے دریافت کیا۔ شاید جو سنا تھا' اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

"ہاں۔۔۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"لیکن تمہیں پہلے اپنی پڑھائی مکمل کرنی چاہیے۔ جاب وغیرہ اس کے بعد۔" اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"زبردستی پڑھنے کا فائدہ جب میرا دل ہی نہیں چاہ رہا تو فضول میں مغزماری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر اسکول بہت ہی قریب ہے۔ بمشکل دس منٹ کی واک ہوگی۔ میں مصروف بھی ہوجاؤں گی اور کوئی مشکل بھی نہیں ہوگی۔"

وہ کہنا تو یہ چاہتی تھی کہ تمہیں میرے معاملات میں مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو چاہوں گی' وہ کروں گی۔ مگر آخر اتنے سال اس کے گھر روٹیاں توڑی تھیں اور وہ احسان فراموش یا نمک حرام کہلوانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اپنا لہجہ نارمل ہی رکھا۔ وہ اس کے فیصلہ کن انداز پر چپ ہوگیا اور کندھے اچکا کر بولا۔

"اچھا خیر' جیسی تمہاری مرضی۔"

پھر جب جانے کے لیے کھڑا ہوا تو ایک بڑا سا شاپنگ بیگ اس کی طرف بڑھایا۔ "اس میں تمہارے لیے کپڑے ہیں۔ مجھے لیڈیز شاپنگ کا کوئی تجربہ تو نہیں ہے۔ بس جو سمجھ میں آیا لے لیا۔ شاید تمہیں پسند بھی نہیں آئیں۔ لیکن میں نے سوچا۔ سردیاں شروع ہونے والی ہیں۔ تمہیں گرم کپڑوں کی ضرورت ہوگی۔"

وہ اب اس کی دی ہوئی بھیک لینا نہیں چاہتی تھی مگر پھر وہی بات نمک اور حق نمک سو بڑے' نارمل انداز میں بولی۔

"میرے پاس بہت کپڑے ہیں۔ ضرورت ہوگی تو آپ سے ہی کہوں گی۔"

اس کے جواب پر اس نے بہت چونک کر اسے دیکھا جیسے کچھ سمجھنا چاہتا ہوں۔

"اب تو میں لے آیا ہوں۔ واپس لے جا کر کیا کروں گا۔"

ناچار اس نے وہ تھیلا بڑی بے دلی سے پکڑ لیا۔ یہ اور بات کہ اس کے جانے کے بعد بغیر دیکھے وہ جوں کا توں کمرہ صاف کرنے والی ماسی کو دے دیا۔ وہ بے چاری اتنے سارے قیمتی اور نئے نئے جوڑے دیکھ کر پھولی نہ سما رہی تھی۔ اسے بہت ساری دعائیں دے کر اور اس کی سخاوت اور دریا دلی کے قصیدے پڑھ کر چلی گئی۔ اس کے بعد ماسی نے اس کے کمرے کی صفائی اور بھی دل لگا کر کرنی شروع کردی تو وہ اس کی معصومیت اور سادگی پر بس ہنس ہی سکی۔

♥ ♡ ♡ ♥

جویریہ ہی کے مشورے پر اس نے پیٹرومین سے ایک سال کا ڈپلومہ لینے کا فیصلہ کیا۔ سامنے والے کمرے کی سعدیہ وہیں سے بی ایس سی کررہی تھی۔ وہ اسی کے ساتھ وہاں سے پراسپیکٹس لینے پہنچ گئی۔ سعدیہ تو اندر اپنی کلاس میں چلی گئی۔ اس نے فارم اور پراسپیکٹس لیا اور واپس ہاسٹل آگئی۔ کتنی عجیب بات تھی' وہ لڑکی جو اکیلی اپنے گھر سے چار قدم کے فاصلے پر نہ جاسکتی تھی' آج بے گھر اور بے در ہو کر شہر کی خاک کتنے آرام سے چھان رہی تھی۔ اب اسے اکیلے کہنے جانے میں ڈر بھی نہیں لگتا تھا۔ اور اگر ڈر لگتا بھی تو وہ کیا کرسکتی تھی۔ کون تھا جو اس کی پروا کرتا۔ وہ اپنے حالات سے سمجھوتا کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ کبھی کسی وقت اگر اپنے حالات سے مایوس ہونے لگتی تو سوچتی۔

"میں اکیلی تو ایسے حالات سے نہیں گزر رہی۔ دور کیوں جاؤں جویریہ ہی کی مثال میرے سامنے ہے۔ جس کے والدین نے سولہ سال کی عمر میں اس کی شادی کردی تھی اور پھر شادی کے چار سال بعد اس کے شوہر نے اولاد نہ ہونے کے جرم میں اسے طلاق دے دی تھی۔ طلاق کا بدنما داغ لے کر وہ واپس اپنے میکے آگئی اور خود کو دوبارہ دنیا سے لڑنے کے لیے تیار کرنے لگی۔ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کی۔ مگر اس کے بھائیوں اور بھابیوں کو اس کا وجود گراں گزرنے لگا تو وہ خاموشی سے ان کی دنیا سے نکل آئی اور اخبار کے دفتر میں نوکری کرکے یہاں رہنے لگی۔ "مجھے تو صرف یہ دکھ ہے کہ میرا کوئی نہیں۔ اس کا دکھ تو مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ اپنوں کے ہوتے ہوئے تنہا ہے۔ اسی شہر میں اس کے چار بھائی اپنے عالیشان گھروں میں رہتے ہیں۔ اس بات سے بے نیاز کہ ان کی بہن ایک ہوسٹل میں نہایت مشکل زندگی گزار رہی ہے۔ غریب شہر تو وہ ہے' مجھے اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔" وہ خود کو حوصلہ دیتی۔ اپنے مایوس کن خیالات کو پیچھے دھکیلتی۔

ہاسٹل آکر سکون سے بیٹھ کر پراسپیکٹس پڑھا تو پتا چلا ہاتھوں کے توتے اڑنے کا محاورہ کیوں ایجاد ہوا ہے۔ خالی یہ سوچ لینا کہ ہمیں اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا ہے۔ یہ کشکول توڑ دینا ہے۔ وغیرہ جیسی باتیں تو صرف ہمارے حکمرانوں کو سوٹ کرتی ہیں۔ خالی خولی دعووں سے کشکول نہیں ٹوٹا کرتے۔ اس راہ میں بہت کٹھنائیاں ہیں۔ وہاں کی ہوش ربا فیس واقعتاً اس کے ہوش اڑا گئی۔ اب جب کہ وہ اپنی اوقات اچھی طرح پہچان چکی تھی۔ اسے پتا تھا' حسن ہاسٹل کے چھ ماہ کے چارجز ایڈوانس جمع کرواچکا ہے۔ ابھی تو یہ بات بھی سوالیہ نشان تھی کہ اس کے بعد وہ یہاں کے چارجز کہاں سے دے گی۔ خالی ڈھائی ہزار میں کمائیں کے کیا اور بچیں گے کیا کے جواب نہیں مل رہے تھے۔

"خیر مایوس ہونے سے تو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ بھوکا تو نہیں مارے گا۔ اور اگر یہ جگہ میں افورڈ نہ کرپائی تو کسی چھوٹے اور گھٹیا سے ہاسٹل میں رہنے میں بھی کوئی شرمندگی نہ ہوگی۔" اپنی یہ پریشانی تو وہ جویریہ سے بھی شیئر نہیں کرسکتی تھی کہ اسے اپنی عزت نفس ہر چیز سے زیادہ مقدم تھی۔

رات بھر سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کے اکاؤنٹ میں پڑے ڈیڑھ لاکھ جو شاید اماں نے اس کا جہیز بنانے کے لیے رکھے تھے اسی موقع پر کام آئیں گے۔ جب تک وہ کوئی بہتر ملازمت حاصل نہیں کرپاتی یہاں کے چارجز اور پیٹرومین کی فیس اسی میں سے نکال کر بھرے گی۔

اپنی اس سوچ پر وہ خود کو شاباش دیتی اسی دن بینک چلی آئی بس روٹس جویریہ سے معلوم کرکے وہ اکیلی نکل آئی۔ آخر انسان کب تک دوسروں کا سہارا ڈھونڈے' اس طرح تو وہ بھی بہت جلد اس سے تنگ آجائے گی۔ زیادہ پیسے نکلواتے ڈر لگ رہا تھا اس لیے فی الحال اپنی فیس جمع کروانے کے لیے جتنے چاہیے تھے وہ نکلوائے اور واپس آگئی۔

اسے پیٹرومین جاتے تیسرا دن تھا' جب اس صبح حسن چلا آیا۔ وہ جانے کے لیے تیار ہورہی تھی۔ اس کی غیر متوقع آمد پر حیران ہوتی وہ نیچے آئی تو وہ غصے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ اسے سلام کرنے کا موقع دیے بغیر وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"اس دن تو فرمایا جارہا تھا کہ پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ کتابیں زہر لگتی ہیں۔ اب پیٹرومین جانے کا شوق اچانک کہاں سے بیدار ہوگیا۔"

وہ اس کے جاسوسی انتظام پر حیران رہ گئی۔ "یہ تو مسز کاظمی سے بھی بڑا جاسوس ہے' وہ سر جھکا کر بس یہی سوچ سکی۔ جب کہ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اسے ڈانٹ رہا تھا۔

"ایک تو اپنے کو سمجھتی بہت ہیں' ان سے نمٹوں تو تم کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کردیا کرو۔" وہ سر جھکائے کھڑی تھی' اس لیے نہیں کہ اپنی کسی حرکت پر شرمندہ تھی بلکہ اس لیے کہ اپنی آنکھوں کی باغیانہ اور سرکش کیفیت اس سے چھپانا چاہتی تھی۔

"میں نے سوچا' ایم ایس سی کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ پھر آج کل تو کمپیوٹر کی بہت ویلیو ہے۔" لہجہ بھی دھیما سا تھا۔

"اگر یہی بات تھی تو مجھے نہیں بتا سکتی تھیں جیسے میں یونیورسٹی کے فارم لایا تھا۔ وہاں کے بھی لے آتا۔ مگر تمہیں تو عادت ہے بے وقوفانہ کام کرنے کی۔ دوسروں کو پریشان کرنا شاید تمہیں اچھا لگتا ہے۔" وہ بدستور کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

اس کے چپ چاپ سر جھکائے کھڑے ہونے پر اسے اور غصہ آرہا تھا۔

"اب یہ سر جھکا کر کھڑے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے الٹی سیدھی حرکتیں کرو۔ بعد میں شرمندہ ہو۔"

وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اسے کوئی شرمندگی نہیں ہے مگر کہہ نہ سکی۔

"میں بھول گئی تھی۔ آپ سے کہنا یاد نہیں رہا۔" اگر جواسے میرے خیالات کا پتا چل جائے تو شاید میرا مذاق ہی اڑائے کہ ہمارے ٹکڑوں پر پلی آج خودداری اور انا کی باتیں کررہی ہے۔ وہ اس سے اپنی سوچ کی تبدیلی چھپانا چاہتی تھی۔

"بھول گئی تھیں' واہ کیا بات ہے۔ بھئی اتنی مصروف شخصیت کو یہ چھوٹی موٹی باتیں یاد بھی کہاں رہتی ہوں گی۔" اب کے لہجہ طنزیہ اختیار کیا گیا تھا۔ پھر اسے گھورنے کے بعد وہ بولا۔

"فیس کے لیے پیسے کہاں سے آئے؟۔ مجھ سے کیوں نہیں کہا۔؟"

"پیسے میرے پاس جمع تھے۔ وہی بھر دیے۔ اس کے بعد چاہیے ہوں گے تو آپ سے لے لوں گی۔" پھر وہی نمک وغیرہ جیسی بے ہودہ باتیں اسے سننا پڑی تھیں۔

"آئندہ کوئی ایسی حرکت کی تو تمہارا دماغ ٹھیک کردوں گا۔ ویسے تم آتی جاتی کیسے ہو؟" دھمکی دیتے ایک دوسری بات یاد آئی تو لہجہ سوالیہ ہوگیا۔

"وہ میرے روم کے سامنے سعدیہ رہتی ہے۔ وہ وہیں سے بی سی ایس کررہی ہے۔ اسی کے ساتھ جاتی ہوں۔"

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ کچھ دیر بعد وہ چلا گیا تو وہ بھی غصے میں کھولتی سعدیہ کے ساتھ ہاسٹل سے نکل آئی۔ اس کی آج کی باز پرس پر اپنا التجائیہ انداز اسے زہر لگ رہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اپنے کمرے سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا شروع ہوا تو اس کی دوستیں بھی بن گئیں۔ ہائے ہیلو تو تقریباً سب ہی سے تھی۔ مگر بالخصوص جویریہ اور اس کا گروپ اسے پسند آیا تھا۔ ان لوگوں نے بھی اسے خندہ پیشانی سے ویلکم کیا تھا۔ ان کے برابر والے کمرے کی فریال انصاری جس کے ممی' ڈیڈی اور چھوٹا بھائی جدہ میں رہتے تھے اور وہ انٹر کے بعد مزید تعلیم کے لیے جدہ سے کراچی آگئی تھی۔ اس کے ڈیڈی رشتے داروں کے گھر رہنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اس لیے وہ ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔ رشتے داروں سے ملنے ہر ویک اینڈ پر جایا کرتی تھی۔ وہ بے حد زندہ دل اور ہنسنے ہنسانے والی لڑکی تھی۔ این ای ڈی یونیورسٹی میں آرکیٹیکچر۔ فرسٹ ایر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ امیر ماں باپ کی نازوں پلی بیٹی مگر نخرا نام کو نہیں۔ اس کے ڈیڈی نے اسے یونیورسٹی آنے جانے کے لیے گاڑی تک دلوائی ہوئی تھی۔ اس کے پاس پینٹیم تھری (Panteiem 3) کمپیوٹر بھی تھا اور اس سہولت کا فائدہ فاطمہ کو بہت ہوا تھا۔ وہ انسٹی ٹیوٹ سے جو کچھ سیکھ کر آتی' اس کے کمپیوٹر پر پریکٹس کرلیا کرتی۔ خود فریال کے لیے کمپیوٹر کا واحد مصرف اپنے چھوٹے بھائی سے چیٹنگ یا ممی اور جدہ کی فرینڈز کو ای میل کرنا تھا۔ اس کی اس بات پر سب ہی اس سے کہتے "اس کام کے لیے تو کوئی دس پندرہ ہزار کا معمولی گھسے پٹے ماڈل کا کمپیوٹر بھی کافی تھا۔ کیوں پینٹیم تھری کو بدنام کررہی ہو۔" وہ ہنس دیا کرتی۔

گراؤنڈ فلور کی عائشہ سومرو اور عظمیٰ کیانی جو روم میٹس تھیں۔ وہ بھی اسی گروپ کا حصہ تھیں۔ عائشہ حیدر آباد کی رہنے والی تھی۔ اس کے بابا سائیں بہت بڑے وڈیرے ہونے کے باوجود تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ اس لیے خاندان کی مخالفت مول لے کر بیٹی کو میڈیکل کی تعلیم دلوا رہے تھے۔ وہ ڈی ایم سی میں پڑھتی تھی۔

عظمیٰ کا تعلق فیصل آباد سے تھا۔ وہ اپنی فیملی کو سپورٹ کرنے کے لیے جاب کررہی تھی۔ اس نے فائن آرٹس میں ماسٹرز کیا ہوا تھا اور کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازمت کررہی تھی۔ اس کی منگنی اپنے پھوپھی زاد سے چار پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔ اسے اپنے بھائی کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار تھا۔ وہ چاروں اس سے اچھی طرح ملتیں' جلد ہی اس کی ان لوگوں سے بے تکلف دوستی ہوگئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

پہلی تاریخ آئی تو وہ خود کو تیار کرنے لگی "اسے کس طرح منع کروں گی؟ کیا کہوں گی؟" اس قسم کے کئی سوال وہ صبح ہی سے خود سے کررہی تھی۔ رات آٹھ بجے اسے پیغام ملا "آپ کے کزن باہر گیٹ پر آپ کا انتظار کررہے ہیں۔"

وہ خود کو تیار کرتی نیچے آگئی۔ گیٹ تک آئی تو وہاں موجود سیکیورٹی گارڈ نے اسے باہر نکلنے کے لیے راستہ دیا۔ وہ گیٹ سے ایک قدم باہر نکلی تو وہ جو اپنے دوست سے کچھ بات کررہا تھا' اسے آتا دیکھ کر جلدی سے اس کے پاس آگیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اس کے دوست نے گاڑی کا انجن بھی بند نہیں کیا تھا۔ برابر والی سیٹ کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اس نے شاید اپنے دوست سے کہا ہوگا "بس ایک سیکنڈ رکو' میں اس مصیبت سے پیچھا چھڑا کر ابھی آتا ہوں۔ اماں کو بھی کیسے کیسے بھیک منگوں سے رشتے جوڑنے کا شوق تھا۔"

"کیسی ہو؟" معمول کے مطابق سب سے پہلے یہی سوال کیا گیا۔ پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے والٹ سے پیسے نکال کر اسے پکڑتا ہوا بولا۔

"کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔"

ہاں اگر وہ سامنے کھڑی ہے تو ٹھیک ہی ہوگی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا جواب سننے وہ رکے جب کہ اسے جلدی بھی بہت ہے۔ اس نے پیسے لینے کے

لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تو وہ کچھ جھنجھلا کر اسے دیکھنے لگا۔

"مجھے پیسے نہیں چاہئیں۔" آخر کار وہ بہت ہمت کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ بھاڑ میں جائے نمک اور نمک خواری۔ ویسے بھی اس دنیا کا دستور یہی ہے لوگ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں۔ سانپ کو دودھ پلاؤ تو وہ ڈس لیتا ہے۔ سوا سے بھی آج اس کی تمام نیکیوں کا اگر وہ یہ صلہ دے رہی تھی تو کیا ہوا۔ ایک بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو تمام خوف اور جھجک بھی جاتی رہی۔ وہ بہت بے خوفی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ ایک ٹک حیرت سے بت بنا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کا دوست انتظار سے تنگ آ کر گاڑی کو مکمل حالت سکون میں لے آیا تھا۔ مگر اسے جیسے اب کہیں جانے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ کچھ دیر تک اسے بغور دیکھنے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو وہ اس کے بولنے سے پہلے کہنے لگی۔

"میں جاؤں؟"

"ہاں جاؤ۔" وہ پتا نہیں کس بات پر مسکرایا تھا۔ اسے خدا حافظ کہے بغیر وہ گیٹ میں گھس گئی تو وہ پیسے واپس والٹ میں ڈالتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اس رات سونے کے لیے لیٹی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی بوجھ سے آزاد ہو گئی ہے۔ اس دنیا میں آپ یا تو اپنے باپ کا پیسہ پورے استحقاق کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں یا پھر خود اپنا۔ اس کے علاوہ کسی اور کا دیا صرف احسان ہی ہو سکتا ہے۔ آخر ضرب المثل اور محاورے ایجاد کرنے والوں نے باپ کا مال سمجھ رکھا ہے یا یہ تمہارے باپ کا گھر ہے۔ وغیرہ جیسی باتیں کچھ سوچ کر ہی کہی ہوں گی۔ اگر اب تک کی زندگی بے خبری سے گزار دی تھی تو یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ آئندہ بھی ایسے ہی جیا جائے۔

"ہاں اب میں تمہارے حصار سے نکل آئی ہوں اور مجھے طفیلی بن کر زندگی گزارنے کا کوئی شوق نہیں۔"

♥ ♡ ♡ ♥

اتوار کا دن تھا۔ وہ پانچوں ان میں چہل قدمی کرتے ہوئے گپ شپ میں مصروف تھیں۔ تب ہی گیٹ سے اندر آتے حسن کو دیکھ کر عائشہ اس سے بولی۔

"فاطمہ! تمہاری کیا مسز کاظمی سے کوئی رشتے داری ہے۔ تمہارے کزن کے آنے پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔" اس کی اس بات پر وہ سب ہنس پڑی تھیں۔ ابھی کل ہی اس کے کزن شہریار کی آمد پر مسز کاظمی نے عائشہ کی خاصی طویل کلاس لی تھی۔ حالانکہ وہ بے چارہ اتنی دور سکھر سے اسے ملنے آیا تھا۔ اس کا کزن سکھر میں اے سی تھا اور اس کے ہر پندرھویں دن چکر لگانے پر وہ سب ہی سمجھ چکی تھیں کہ کیا چکر ہے۔

وہ ان لوگوں سے معذرت کرتی آگے بڑھ کر خود ہی حسن کے پاس آ گئی۔ وہ اپنی سابقہ ٹون سے بات کر رہا تھا۔ ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ برسوں کوئی بات ہوئی تھی۔ معمول کے مطابق اس کی خیریت دریافت کر کے اس نے ایک تھیلی اسے پکڑائی۔ وہ لینے سے انکار کر دیتی مگر پیچھے کھڑی دوستوں کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے پکڑ لی۔ وہ تین چار منٹ بات کرنے کے بعد چلا گیا تو وہ واپس ان لوگوں کے پاس آ گئی۔ وہ سب ندیدیاں اسی وقت تھیلے پر جھپٹ پڑیں۔ اس کے کزن کو دعائیں دیتی وہ اس بڑے سے پراٹھے کا انصاف کر رہی تھیں۔ اسے بھی مجبوراً "چکھنا" پڑا۔

وہ بڑی مصروف زندگی گزار رہی تھی۔ صبح انسٹیٹیوٹ، دوپہر اسکول اور پھر رات میں اسکول کے کام کے ساتھ ساتھ اپنی بھی پڑھائی۔ وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ کمپیوٹر سے متعلق سب کچھ سیکھ رہی تھی۔ آخر اسی پر اس کے روزگار کا دارومدار تھا۔ یوں بیٹھے بٹھائے تو ڈیڑھ کروڑ خرچ ہو جائیں، ڈیڑھ لاکھ کی تو اس مہنگائی میں اوقات ہی کیا ہے۔ اس سے پہلے وہ جانتی نہ تھی کہ پیسہ کہاں سے آتا ہے اور کیسے کمایا جاتا ہے۔ اس نے تو صرف خرچ کرنا سیکھا تھا۔ اس کی ضروریات تو ہمیشہ بغیر کہے پوری ہوتی تھیں۔ مگر اب یہ تمام باتیں اپنی تمام جزئیات سمیت سمجھ چکی تھی۔ وہ پیسے کو دانت سے پکڑ کر رکھتی تھی۔ جس جگہ سو خرچ کرنے ہوتے وہ کوشش کرتی کہ دس روپے میں کام ہو جائے۔ آنے جانے کے بس کے کرائے کے علاوہ وہ فالتو ایک پیسہ خرچ نہیں کرتی تھی۔ اسی لیے اپنی تنخواہ میں سے بھی کافی کچھ بچا لیتی تھی۔

حسن اپنے روٹین کے مطابق ہر اتوار کو آتا۔ پانچ چھ منٹ اس کے پاس رکتا، ہی "خیریت سے ہو؟" کوئی پریشانی تو نہیں۔" قسم کے سوال جواب ہوتے۔ وہ بھی نارمل طریقے سے ملتی اور وہ چلا جاتا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو وہ پیسے دینے نہیں آیا تو فاطمہ نے اس کی سمجھ داری کو دل ہی دل میں سلام پیش کیا۔ اسے یہاں رہتے چھٹا مہینہ پورا ہونے والا تھا اور وہ حسن سے پہلے خود ہی یہاں کا کرایہ ادا کر دینا چاہتی تھی۔ اسی لیے اکتیس تاریخ کو بینک چلی آئی۔ یہ اس کا بینک کا دوسرا چکر تھا۔ اماں کی زندگی میں بھی وہ بہت مرتبہ ان کے ساتھ یہاں آیا جایا کرتی تھی۔ بینک منیجر فرقان حمیدی سے اماں کی اچھی سلام دعا تھی۔ اسی حوالے سے وہ اس سے بھی اچھی طرح ملتے۔ بینک کی یہ برانچ اس کے گھر سے بہت قریب تھی۔ پیسے نکلوانے سے پہلے اس نے یونہی اپنا بیلنس چیک کیا تو اکاؤنٹ میں موجود اضافی چھ ہزار روپوں کو دیکھ کر وہ بری طرح تپ گئی۔ فرقان حمیدی کہنے لگے۔

"حسن تمہارے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کروا کر گیا تھا۔" وہ نہ بھی بتاتے تب بھی وہ جانتی تھی کہ یہ حرکت کس کی ہے۔ ان کے سامنے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا۔ ان کے اصرار پر چائے پیتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک خیال آیا جس کا اظہار اس نے فرقان انکل سے کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ کچھ حیران ہو رہے تھے۔

"اصل میں انکل! یہاں عزیز آباد تک آنا کافی مشکل پڑتا ہے۔ اپنے ہاسٹل کے قریب کی برانچ میں پیسے منتقل کروا لوں گی تو آسانی ہو جائے گی اور پھر میں آپ کے ہاں سے اپنا تعلق ختم تو نہیں کر رہی۔ یہاں بھی میرا اکاؤنٹ موجود رہے گا۔"

پھر ان ہی کی مدد سے اس نے اپنے ڈیڑھ لاکھ میں سے بچی ہوئی رقم ہاسٹل سے قریب ترین برانچ میں منتقل کروالی۔ اماں کا ریٹائرمنٹ پر ملنے والا پیسہ اور یہ چھ ہزار وہیں چھوڑ دیے۔ اسے اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ وہ اس کی اس حرکت پر کیا سوچتا ہے۔ اس کا جو دل چاہے سوچتا رہے۔ میری بلا سے۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا ہوگا کہ میں نے اپنی فیس میں سے پیسے نکلوا کر بھری تھی۔ پتا چل جائے میری بلا سے۔"

اسے تو میری بلا سے اور مائی فٹ کہہ دیا تھا مگر وہ اماں سے سخت شرمندہ تھی۔

"اماں! مجھے آپ کے خلوص پر رتی برابر بھی شبہ نہیں۔ آپ نے تو میرے ساتھ وہ سب بھی کیا جس کی میں مستحق نہ تھی۔ آپ کی محبت، آپ کا بے لوث پیار میرا سرمایہ حیات ہے۔ مگر میں یہ پیسے نہیں لے سکتی۔ پہلے ہی میں آپ سے اپنے حق سے بہت زیادہ وصول کر چکی ہوں۔ ان روپوں پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔"

اس کا اب دوبارہ بینک کی اس برانچ آنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

اگلے روز اتوار نہیں تھی مگر وہ پھر بھی چلا آیا تھا۔ وہ اس کی غیر متوقع آمد کی وجہ سوچتے وزیٹرز روم میں آئی تو وہ دروازے پر نظریں جمائے اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی تھکی ہاری اسکول سے آئی تھی۔ کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔ اس لیے بھی اس کی آمد بیزار کر رہی تھی۔ تھکے تھکے انداز میں سامنے والے صوفے پر بیٹھتے اسے سلام کیا۔ وہ بڑی غور و فکر سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔" آج حیرت انگیز طور پر "کیسی ہو" کا وظیفہ نہیں پڑھا گیا تھا۔

"ہاں، ابھی اسکول سے آ کر بیٹھی تھی۔" وہ اپنی بیزاری چھپائے بغیر بولی تو وہ ہنس پڑا۔

"کہ میں کسی بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو گیا۔

ہے ناں۔"

اس کی بات کے جواب میں اس نے نوکنٹس والے سیاسی تاثرات چہرے پر سجا لیے۔ اسے پتا نہیں کیوں اس قدر ہنسی آ رہی تھی۔ مسلسل ہوتی بتیسی کی یہ نمائش فاطمہ کو زہر سے بھی بری لگ رہی تھی۔ وہ گھڑی پر نظریں جمائے پانچ منٹ گزرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ پانچواں منٹ پورا ہوا تو وہ یوں کھڑی ہوئی جیسے کسی قید سے رہائی ملی ہو۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ بدستور اپنی جگہ جما بیٹھا چہرے پر معنی خیز سی مسکراہٹ لیے اس کو دیکھ رہا تھا۔ دوبارہ بیٹھنے کا ارادہ ملتوی کیا اور ویسے ہی کھڑی رہی۔ وہ اس کے کھڑے ہونے کا نوٹس لیے بغیر بیٹھا رہا تو تمام تر لحاظ اور مروت بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ بول پڑی۔

"مجھے ابھی عصر کی نماز پڑھنی ہے۔ ٹائم ختم ہونے والا ہے۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھتا کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"تم کچھ زیادہ سنجیدہ نہیں رہنے لگیں۔ لگتا ہے' تمہاری دوستیں بہت بور اور ڈل ہیں۔"

"میں ہمیشہ ہی سے سنجیدہ ہوں۔" اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

کوئی جواب دیے بغیر وہ ابھی بھی یونہی کھڑا اسے دیکھتا رہا تو وہ بری طرح چڑ گئی۔ "آج موصوف کچھ زیادہ ہی فرصت سے ہیں۔ واپسی کا ارادہ ہی نہیں ہے۔"

جبکہ وہ اس کے چہرے کو یوں دیکھتا رہا جیسے کوئی بہت ہی دلچسپ منظر دیکھ رہا ہو۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر وہ کچھ الجھ سی رہی تھی اس لیے خود قصداً" ادھر ادھر نظریں گھما رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے جان بخشی ہوئی اور وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا تو وہ بھی اپنے کمرے میں آ گئی۔

اتوار کے روز بھی وہ آ گیا تو فاطمہ کا موڈ بری طرح آف ہو گیا۔ آخر یہ کسی آسیب کی طرح میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ دل تو چاہا کہ ملنے سے انکار کر دے مگر مصلحت بھی کوئی چیز ہوتی ہے اس لیے نیچے آ گئی۔ اس

دن کے مقابلے میں آج بتیسی اندر تھی۔ مگر آنکھیں مسکراتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنی بے زاری چھپانے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ جب تک بات چھپی ہوئی تھی چھپی تھی اب جب سب کھل گیا تو بلاوجہ بننے کا فائدہ۔ سلام کرنے کے بعد وہ اس کے کچھ اور کہنے سے پہلے خود ہی کہنے لگی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں' آپ ناحق میری وجہ سے زحمت کر کے اتنی دور آتے ہیں 'یقیناً' اپنی بہت سی مصروفیات چھوڑ کر مجھے کوئی پرابلم ہو گی تو میں آپ سے خود ہی کانٹیکٹ کر لیا کروں گی۔"

اصولاً" تو اسے اس بات کو اپنی انسلٹ سمجھنا چاہیے تھا۔ وہ سیدھا سیدھا اس کے یہاں آنے کو ناپسند کر رہی تھی۔ مگر وہ یوں مسکرا رہا تھا جیسے کوئی بہت ہی انجوائے کرنے والی بات سنی ہو۔ جیسے یہ سچویشن اسے بہت مزہ دے رہی ہو۔

اس کی بات کے جواب میں کچھ کہے بغیر تین وزنی شاپنگ بیگز اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"تمہارے لیے بہت اچھی شاپنگ کر کے لایا ہوں۔ عدیل میرے ساتھ تھا اور اسے لڑکیوں کی چیزیں خریدنے کا بڑا وسیع تجربہ ہے۔"

وہ اس کی مسکراہٹ اور ہاتھ میں پکڑی اشیاء پر نظر ڈالے بغیر بولی "آپ میرے لیے چیزیں مت لایا کریں۔" جواب میں وہ یوں مسکرایا جیسے یہ جواب اس کے لیے غیر متوقع نہ تھا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگتا۔؟" وہ بڑی فرصت سے کیوں کی گردان کرنے میں مصروف تھا۔

"ضروری نہیں کہ میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں۔ معاف کیجیے گا۔ میں کچھ مصروف ہوں۔"

وہ جواب دیتی ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی اور اسے خدا حافظ کہتی دروازے سے باہر نکل آئی۔

اس کا خیال تھا کہ اس کی اتنی بدتمیزی اور بدتہذیبی پر وہ اس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے 'لعنت' بھیج دے گا اور

شاید دل ہی دل میں اسے گالیاں دے کر یہ بھی کہے کہ اس کے نمک میں تاثیر نہیں اور یہ کہ یہ دو ٹکے کی لڑکی جو کل تک میری محتاج تھی۔ میری دی ہوئی بھیک پر زندہ تھی۔ آج میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے۔ اپنی اوقات بھول گئی ہے۔ مگر وہ اس کے تمام خیالات کو غلط ثابت کرتا ہر اتوار کو چلا آتا۔ ہاں اب وہ اس کے لیے کوئی چیز نہیں لاتا تھا۔ پہلی تاریخ کو پیسے نہیں دیتا تھا۔ یہ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ تم ہاسٹل کا کرایہ خود کیوں دینے لگی ہو۔ البتہ آتا کھڑے کھڑے۔ بمشکل تین چار منٹ رکتا اور چلا جاتا۔ اسے شاید یاد بھی نہیں رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کتنی بدتمیزی سے پیش آ چکی ہے۔ معمول کے مطابق خیر خیریت پوچھتا وہ اسے حیران کر دیتا۔ اس کے اتنی مستقل مزاجی سے آنے پر فاطمہ نے یہ سوچ کر صبر کر لیا تھا کہ بے چارہ اماں سے کیے وعدے کا پابند ہے۔ آخر اسے اپنی اماں دل و جان سے زیادہ عزیز تھیں وہ ان کی کوئی بات کیسے رد کر سکتا ہے۔ حسن کی اس مجبوری سے اس نے بھی سمجھوتا کر لیا۔ اور دوبارہ اس کے آنے پر کبھی کچھ نہیں کہا۔

♥ ♡ ♡ ♥

کراچی جیسے شہر کی انتہائی حدوں کو چھوتی مہنگائی نے اس کے تمام ناکے ڈھیلے کر دیے تھے۔ تمام تر بچت اور کفایت شعاری کے باوجود بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔ سال بھر کا ڈپلومہ کورس ختم ہوتے ہوتے اسے ایسا لگا کہ اب کسی سے ادھار مانگے بغیر گزارا نہیں ہے۔ ایسی کسی صورت حال سے بچنے کے لیے اس نے اپنے گلے میں پڑی چین اور کانوں کی بالیاں جو اس کی سگی ماں کی نشانیاں تھیں' ایک روز اسکول سے آتے ہوئے اکیلے ہی جا کر بیچ دیں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ جیولر شاپ پر آئی تھی وہ بھی کچھ بیچنے اس کے ہاتھ پاؤں باقاعدہ کانپ رہے تھے۔

"ہو سکتا ہے اس نے میری ہوتی شکل کا فائدہ اٹھا کر مجھے لوٹا ہی ہو۔ مگر یہ کام میں اپنی دوستوں کے ساتھ تو نہیں کر سکتی تھی نا کہ بے تکلفی ہو یہ بات

تو میں کسی سے بھی شیئر نہ کروں۔"

پیٹرولیم کا ڈپلومہ اس کے ہاتھ میں آیا تو وہ جویریہ سے لپٹ گئی۔

"تم اتنے بڑے اور مشہور انگلش نیوز پیپر میں کام کرتی ہو۔ تمہارے تو بہت کانٹیکٹ ہوں گے۔ پلیز مجھے کہیں جاب دلوا دو۔ اب تو کمپیوٹر کا دم چھلا بھی لگ لیا ہے۔"

اس کی بات پر وہ مسکرا دی اور وعدہ بھی کر لیا۔ ہر روز وہ بڑی آس سے اس سے پوچھا کرتی۔ اس کے روز روز پوچھنے پر ایک دن وہ کہہ بیٹھی "تم اپنے کزن سے کیوں نہیں کہتیں۔ ہو سکتا ہے' وہ تمہیں مجھ سے بہتر جاب دلوا دے۔" اس کی بات پر وہ بگڑ کر بولی۔

"اس سے کہنا ہوتا تو تمہاری منتیں کیوں کرتی۔ صاف کہو تم میری مدد کرنا ہی نہیں چاہتیں۔"

وہ جویریہ سے ناراض ہو گئی۔ "جاب نہیں دلوائی تو مت دلواؤ۔ الٹے سیدھے مشورے تو مت دو۔"

اگلے دن سے اس نے سٹنگ روم میں باقاعدگی سے بیٹھ کر تمام اخبارات کا کلاسیفائیڈ والا صفحہ دیکھنا شروع کر دیا۔

اس بات کو ایک ہفتہ ہو گیا تھا' اس دن بھی وہ بیٹھی ڈان کا کلاسیفائیڈ کھنگال رہی تھی۔ جب جویریہ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے گنگنائی۔

"روٹھی ہو تم' تم کو کیسے مناؤں فاطمہ۔ بولو ناں' بولو ناں۔" وہ اس کے گانے کا نوٹس لیے بغیر اخبار میں منہ دیے بیٹھی رہی۔

"مت بات کرو' میرا کیا ہے۔ گلشن چورنگی کے پاس عبید ٹریول ایجنسی میں کمپیوٹر آپریٹر کی پوسٹ خالی ہوئی ہے۔ سیلری بھی اچھی ہے اور ماحول بھی مناسب ہے۔"

وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اخبار ایک طرف رکھ چکی تھی اور اب فرط مسرت سے بے قابو ہوئی اسے سن رہی تھی۔

"تھینک یو۔ جویریہ تھینک یو۔ میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں۔ تم نے میری کتنی بڑی مشکل حل کر

دی ہے۔ تم کتنی اچھی ہو۔ تمہارے جیسا اچھا تو شاید کوئی اور ہو بھی نہ یو آر گریٹ۔ آئی ریئلی لو یو۔"

وہ خوشی کے مارے اس سے لپٹ گئی تھی۔ آس پاس بیٹھی لڑکیاں دلچسپی سے یہ نظارا دیکھ رہی تھیں۔

"ہٹو پرے۔ مطلبی دوستی کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ ابھی کیسے منہ پھلا کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اب اچانک مجھ پر اتنا پیار آگیا۔" اب ناراض ہونے کی باری جویریہ کی تھی۔

"سوری یار! معاف کردو ناں۔ بس مجھے تم پر غصہ آ گیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا' تم میری بات کو سیریس نہیں لے رہیں۔"

"ہر کسی کو بدگمانی کی عینک لگا کر مت دیکھا کرو اور سیریس ہونے کا کیا مطلب ہے۔ میں آنسو بہا کر اور منہ لٹکا کر تمہاری بات سنتی تب ہی تمہارے خیال سے میں سیریس ہوتی۔ آئی ایم سوری میڈم! اس قسم کی سنجیدگی کی توقع آپ مجھ سے کبھی مت رکھیے گا۔"

کچھ دیر روٹھنے منانے کا سیشن چلا پھر وہ اس بات پر مانی کہ فاطمہ اپنی پہلی تنخواہ ملنے پر ان سب کو ٹریٹ دے گی۔ اس نے فوراً" مان لیا تھا۔

رات سونے سے پہلے جویریہ نے اسے بتایا "میرے کولیگ ارشد کے جاننے والے ہیں یہ عبید وارثی صاحب۔ لگ بھگ پچاس سال کے ہیں مگر اس عمر میں بھی ہم لوگوں سے کہیں زیادہ اسمارٹ اور ایکٹو ہیں۔ میں نے ارشد سے کہا تھا کہ کوئی ویکنسی۔ ہو جو کسی لڑکی کے لیے مناسب بھی ہو تو اس نے وہاں کا بتایا۔ وہ سفارش وغیرہ کے سخت مخالف ہیں۔ ارشد کے اصرار پر صرف اس شرط پر راضی ہوئے ہیں اگر تمہاری کارکردگی انہیں مطمئن کر سکی تو تمہیں مستقل اپنے پاس جاب دیں گے ورنہ ایک مہینے بعد چھٹی کر دیں گے۔ یوں سمجھو کہ تم ایک مہینے کے ٹرائل پر رکھی جا رہی ہو۔ اگر کنفرم ہو گئیں تو تمہاری تنخواہ آٹھ ہزار روپے ہوگی اور پہلے مہینے تمہیں صرف چار ہزار روپے دیے جائیں گے۔ اب اگر تم ان شرائط پر راضی ہو تو کل وہاں چلی جاؤ۔"

وہ تو اس سے بھی کڑی شرائط قبول کرنے کو تیار تھی سو دل و جان سے راضی ہو گئی۔ نوکری اس کا شوق نہیں ضرورت تھی اور ضرورت تو انسان ہر قیمت پر پوری کرنا چاہتا ہے۔ عبید صاحب خاصے روکھے پھیکے سے آدمی تھے۔ اس سے بغیر کسی گرم جوشی کے ملے اور وہ تمام باتیں دہرا دیں جو وہ جویریہ سے پہلے ہی سن چکی تھی۔

وہ اس کی ایڈہاک ملازمت کا پانچواں دن تھا جب کی بورڈ اور ماؤس پر ہاتھ چلاتے اور مانیٹر پر نظریں جمائے اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کی میز کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھا ہے۔ نہ صرف بیٹھا ہے بلکہ بہت غور سے اسے دیکھ بھی رہا ہے۔ فوراً" سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو سامنے موجود شخصیت اس کا موڈ بری طرح خراب کر گئی۔ آخر اسے میری جاسوسی پر کس نے مامور کیا ہے۔ وہ بری طرح جل رہی تھی۔ چہرے پر پھیلتی ناگواری اس سے چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

"بڑوں کو سلام کرنے سے اللہ بہت خوش ہوتا ہے۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے شوخی سے بولا۔

"اسلام علیکم۔" اس نے لٹھ مارا۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو' خوش رہو' خوب ترقی کرو' تمہیں کمپیوٹر آپریٹ کرتے دیکھ کر جتنی خوشی مجھے ہو رہی ہے۔ اتنی شاید خود تمہیں بھی نہیں ہوئی ہوگی۔" وہ اس کے لٹھ مار انداز کا برا مانے بغیر ہنس کر کہہ رہا تھا۔

"تھینکس۔" اس نے مختصر جواب دے کر دوبارہ اپنی نظریں اسکرین پر جما دیں۔ حالانکہ پتا تھا کہ اس کی موجودگی میں وہ کوئی کام نہیں کر سکتی۔

"میرا خیال ہے' اب تو تم مجھے سوفٹ ویر اور ہارڈ ویر کا فرق ضرور بتا سکتی ہو۔" اس کا وہ مذاق اڑاتا انداز اسے پاگل کر رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا پاس رکھا پیپر ویٹ اٹھا کر اس کے سر پر مارے۔

"کیسی چل رہی ہے جاب؟ کوئی مسئلہ تو نہیں؟"

بڑی فکر مندی سے یہ سوال یوں کیا گیا۔ گویا یہ نوکری اسی کے طفیل ملی ہو۔

"آپ کی دعائیں ہیں۔" وہ دانت پیس کر بولی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

اسی وقت عبید صاحب اپنے آفس سے باہر نکلے تو وہ الرٹ ہو کر جلدی سے کی بورڈ اور ماؤس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ارے حسن عباس ہمارے دفتر میں۔ کیسا خوشگوار سرپرائز ہے۔" وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر آگے بڑھ کر گرم جوشی سے حسن سے ہاتھ ملانے لگے۔ ان کا وہ روڈ اور خشک انداز لمحوں میں غائب ہو گیا تھا۔ وہ بڑے اصرار سے اسے اپنے دفتر میں لے گئے تو فاطمہ کا دل جل کر خاک ہو گیا۔ اپنی اہمیت اور تعلقات جتانے ہی کے لیے موصوف میری جاسوسی کرتے یہاں آئے ہیں۔ کہ دیکھو تم جہاں ٹرائل پر رکھی گئی ہو۔ وہاں میری کتنی عزت اور آؤ بھگت ہوتی ہے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اور عبید صاحب باہر آئے تو وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ دھیان تو اندر عبید صاحب کے کمرے کی طرف تھا مگر کام سے کوتاہی بھی نہیں برتی جا سکتی تھی۔

"چلو میں تمہیں چھوڑتا ہوا چلا جاؤں گا۔" عبید صاحب اور وہ اس کے پاس ہی آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے کوئی بدتمیزی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے نرمی سے بولی۔

"ابھی آفس ٹائم ختم ہونے میں ایک گھنٹہ باقی ہے۔ آپ چلے جائیں، میں آجاؤں گی۔"

وہ اس کے شریفانہ جواب پر بے ساختہ سی مسکراہٹ کو روکتے ہوئے عبید صاحب سے بولا۔

"کیوں سر! میری کزن کو ایک گھنٹہ پہلے آف مل سکتا ہے؟"

اس کے مذاق کو انہوں نے بڑا انجوائے کیا اور باقاعدہ ایک زور دار قہقہہ لگا کر بولے۔ "بالکل اجازت ہے جناب۔"

وہ دونوں اس کے سر پر کھڑے اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ سچویشن کچھ ایسی تھی کہ وہ کسی انتہائی ردِ عمل کا اظہار نہیں کر سکتی تھی اس لیے خاموشی سے کمپیوٹر آف کرتی اپنا بیگ لٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ ارادہ یہی تھا کہ باہر نکل کر اسے دو چار کھری کھری سنا کر بس میں سوار ہو جائے گی۔ مگر عبید صاحب کو تمام خوش اخلاقی اور آداب میزبانی آج ہی یاد آ رہے تھے۔ باہر نکل کر انہوں نے اس وقت تک اپنی گاڑی کی طرف قدم نہیں بڑھایا جب تک کہ حسن نے گاڑی اسٹارٹ نہ کر لی۔ اس کے برابر گاڑی میں بیٹھی وہ اپنی پسپائی کا ماتم کر رہی تھی۔ وہ اپنی کامیابی پر بڑا خوش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وسلنگ کرتے ہوئے کسی انگلش گانے کا میوزک دیا جا رہا تھا۔

خیالات کی رو ٹوٹی تو اس نے اس گاڑی پر غور کیا۔ اچھا تو جناب نے ذاتی گاڑی خرید لی ہے۔ آفس کی گاڑی تو یہ کہیں اور استعمال نہیں کرتے کہ بے چارے بہت ایمان دار، غیور اور انا پسند ہیں۔ وہ اس بلیک سوک کو بڑی نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ اسے رد کرنے کی خواہش اتنی شدت سے ابھرتی تھی کہ دل چاہتا تھا اسے اور اس سے وابستہ تمام چیزوں کو ملیا میٹ کر دے۔ گاڑی کا رخ ہاسٹل جانے والے راستے پر نہ دیکھ کر وہ بول پڑی۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"تمہیں اغوا کر رہا ہوں۔" بڑے سکون سے جواب دیتا وہ ڈرائیو کرتا رہا۔ وہ ابھی اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی جب اس نے گاڑی کے ایف سی کے سامنے روکی۔ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر اترتا وہ اس کی طرف آ گیا۔

"اترو کیا فریز ہو گئی ہو۔" اس کے بولنے کی دیر تھی، وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور اس کی طرف دیکھے بغیر قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ اسے بس اسٹاپ کی طرف جاتا دیکھ کر اس کے پیچھے آیا اور قدرے ناراض لہجے میں بولا۔

"تم تو بہت ہی بدتمیز ہو چکی ہو۔"

"جیسی بھی ہوں، آپ سے کم از کم بہت بہتر ہوں۔"

خوامخواہ دوسروں کی جاسوسی نہیں کرتی، کسی کے پرسنلز میں مداخلت نہیں کرتی اور دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے چھچھوری حرکتیں نہیں کرتی۔"

وہ بغیر کوئی لحاظ روا رکھے بڑی بدتمیزی سے بولی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"کاش آج اماں زندہ ہوتیں تو اپنی لاڈلی کی فراٹے سے چلتی زبان دیکھ کر عش عش کر اٹھتیں۔"

اس کی بات پر ایک ہوک سی دل میں اٹھی "اماں ہوتیں تو کیا میں یوں سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی ہوتی۔ تمہیں تو میں کبھی معاف نہیں کروں گی حسن عباس کہ تم نے مجھ سے میری ذات کا فخر چھینا۔ اماں کی بے تحاشا محبت جو میں نے اپنا حق سمجھ کر وصول کی تھی۔ آج مجھے احسان محسوس ہوتی ہے۔ تم میرے اتنے بڑے مجرم ہو کہ میرا دل کبھی تمہاری طرف سے صاف نہیں ہو سکتا۔" کتنے عرصے بعد اسے اپنی آنکھیں گیلی محسوس ہو رہی تھیں۔ ورنہ اسے آنسو بہائے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ زندگی سے لڑنے میں اتنی مصروف ہوئی تھی۔ رونا بھی یاد نہ رہتا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر گہری نظریں جمائے کھڑا تھا۔

اسی وقت ان کے پاس ایک گاڑی آ کر رکی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر عائشہ چیخی۔

"ہائے فاطمہ جانو! تم یہاں کیا کر رہی ہو۔"

وہ اپنی آنکھیں خشک کرتی اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بڑی ایکسائیٹڈ نظر آ رہی تھی۔ اس کے اتنی زور سے جانو بولنے پر اسے بڑی شرمندگی سی ہوئی۔ جبکہ اس کے ساتھ گاڑی سے اترتا شہریار اور حسن دونوں ہی ہنس پڑے تھے۔ جب سے ان دونوں کا نکاح ہوا تھا۔ یہ بڑی ڈھٹائی سے اس سے ہاسٹل سے باہر مل لیا کرتی تھی۔

اس کے ساتھ کھڑے حسن کو دیکھ کر وہ بڑے معنی خیز انداز میں کھنکاری اور پھر آنکھوں آنکھوں میں اسے ویل ڈن کا اشارہ بھی کیا۔ وہ اس کے اشاروں کنایوں سے توجہ ہٹا کر شہریار سے سلام دعا کرنے لگی۔ عائشہ نے شہریار اور حسن کا آپس میں تعارف کروایا۔

"میرا خیال ہے۔ آپ لوگ بھی کے ایف سی ہی آئے تھے۔" عائشہ نے دیدے مٹکائے۔

"جی ہاں!" حسن نے فوراً جواب دیا۔

"کیا خیال ہے آپ کا ہمیں جوائن کرنے کے بارے میں؟"

شہریار نے حسن سے دریافت کیا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ دعوت میری طرف سے ہو گی۔ آخر آپ دونوں ہی ہمارے کراچی میں مہمان ہیں اور مہمانوں سے حسن سلوک اہل کراچی کی روایت ہے۔"

وہ لوگ اس کی بات پر ہنس پڑے تھے "آپ کہتے ہیں تو مان لیتے ہیں۔ ویسے مشہور تو یہ ہے کہ کراچی والوں سے زیادہ روکھا پھیکا میزبان سارے پاکستان میں کہیں نہیں پایا جاتا۔"

وہ لوگ باتیں کرتے اندر چلے آئے تھے۔ ناچار اسے بھی ان لوگوں کی تقلید میں قدم بڑھانے پڑے تھے۔

"تم دونوں ساتھ کھڑے زبردست لگ رہے تھے۔" عائشہ اس کے کان میں منمنائی تو وہ موقع کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے چپ رہی۔ اندر بیٹھ کر وہ اور شہریار آپس میں باتیں کرنے لگے تھے۔ جبکہ عائشہ ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی اور وہ ارد گرد بیٹھے لوگوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہوا تو عائشہ نے عادت کے مطابق بغیر تکلف کے کھانا شروع کر دیا۔ شہریار اسے ٹوک رہا تھا۔

"کچھ کیلوریز کا خیال کیا کرو۔ دن بدن موٹی ہوتی جا رہی ہو۔" وہ ان کمنٹس کا نوٹس لیے بغیر کھاتی رہی۔

"آپ کیسی دوست ہیں، اسے سمجھاتی نہیں ہیں۔ میرے جیسے اسمارٹ بندے کے ساتھ چلتی یہ کیسی لگے گی۔ اگر جو اس نے اپنی ڈائٹ کو کنٹرول نہ کیا تو۔" وہ فاطمہ کو اس کی کوتاہی سے آگاہ کرنے لگا تو وہ مسکرا دی۔

"میر صادق کی [redacted]اق اڑا رہا ہے اور تم دانت نکال رہی ہو۔ چلو ذرا آج ہاسٹل بتاؤں کی تمہیں اچھی طرح۔"

عائشہ نے چپس کا سپ لیتے اسے گھورا۔ حسن ان لوگوں کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہوتا مسکرا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد کھانا کھا کر جب وہ لوگ باہر نکلے تو عائشہ بھی اس کے اور حسن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ شہریار ان لوگوں کو خدا حافظ کہتا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اسے ابھی واپس سکھر جانا تھا۔ رات میں فریال کے کمرے میں ان لوگوں کی محفل جمی تو عائشہ نے چٹخارے لے لے کر آج کا واقعہ سنایا۔ اس کی بات سن کر سب ہی اس کے پیچھے پڑ گئیں۔

"اچھا تو سوئیٹ کزن سے اب باہر بھی ملاقاتیں ہونے لگی ہیں۔ وہ بھی دوستوں سے چوری چھپے۔"

ان سب کے ہاتھ ایک دلچسپ موضوع آ گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک آدھ مرتبہ اس قسم کی بات ہوئی تھی مگر آج تو ان لوگوں نے اس کا خوب ہی ریکارڈ لگایا تھا۔ اسے گھنی اور میسنی قرار دیا گیا تھا۔ جو خواہ مخواہ دوستوں کے سامنے بنتی ہے۔ وہ ان لوگوں کی بے سروپا باتوں پر سرزنش کرتی تھی سو چپ رہی۔

اگلے روز دفتر گئی تو عبید صاحب کا رویہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ کل تک جو اسے ایک سفارشی سمجھ کر اس کی ایک ایک حرکت پر کڑی نظر رکھا کرتے تھے۔ اچانک ہی مہربان ہو گئے تھے۔ ان کی اس مہربانی کا پس منظر اچھی طرح پتا تھا۔ اس لیے اسے کوئی خوشی نہ تھی۔ اگر وہ اپنی کارکردگی کی بنیاد پر یہاں جگہ بناتی اور عبید صاحب اس کے کام سے خوش ہو کر اسے اہمیت دیتے تو وہ خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ مگر اب ان کا بدلا ہوا انداز اسے اپنی ہتک محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اتنی بے بس، مجبور اور لاچار ہے کہ ساری زندگی دوسروں کی عنایتوں کے سہارے گزارے گی۔ یہ خیال سوہانِ روح تھا۔ پہلی تنخواہ کے طور پر آٹھ ہزار روپے وصول کرتے وہ اپنی محنت کی کمائی کو بھی کسی کی دی ہوئی بھیک سمجھ رہی تھی۔ عبید صاحب نے اس سے کہا تھا کہ حسن عباس کی کزن ہونے کے ناتے وہ اس بات کی مستحق ہے کہ اسے کسی آزمائشی دور سے گزارے بغیر مستقل کر دیا جائے۔

♥ ♡ ♡ ♥

اسے نوکری کرتے تقریباً ایک سال ہونے والا تھا۔ اس روز کے بعد حسن دوبارہ کبھی اس کے دفتر نہیں آیا تھا۔ ہاں اتوار کو چکر لگانا وہ کبھی نہ بھولتا تھا۔ وہی دو چار منٹ رکنا، خیر خیریت کرنا اور چلا جاتا۔ اس دوران اس نے انٹرنل پروگرامنگ اور ایک کورس کا چھ مہینے کا ایڈوانس ڈپلوما کورس بھی کر لیا تو اس کی تنخواہ میں ہزار روپے کا اضافہ ہو گیا۔

اپنے ورکرز سے کام لینے میں عبید صاحب بڑے سخت باس تھے۔ کام کے معاملے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ صبح سے شام تک انتہائی سخت محنت کرتی تو وہ نو ہزار اسے ملتے تھے۔ چھٹی یا ہاف ڈے لیو وغیرہ کی سخت ممانعت تھی۔ عبید صاحب سے چھٹی لینا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ محنت سے نہیں گھبراتی تھی اور پھر یہاں کا ماحول بھی اچھا تھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ یہ نوکری بھی اسے خوش قسمتی ہی سے مل گئی تھی اور وہ اسے کسی قیمت پر گنوانا نہیں چاہتی تھی۔

اس رات وہ سب عظمیٰ اور عائشہ کے مشترکہ کمرے میں لحافوں میں دبکی ڈرائی فروٹس سے شغل فرما رہی تھیں جب اخروٹ منہ میں ڈالتی فریال اس سے بولی۔

"آج تمہارا کزن ملا تھا۔" اسے اس کزن نامے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں ملا؟ کب ملا؟ وہ خود ہی مزید تفصیلات بتانے لگی۔

"میں نے بتایا تھا ناں کہ مجھے autocad سیکھنا ہے۔"

"Auto cad کیا بلا ہے۔ پہلے تو یہ بتاؤ، آگے کی بکواس بعد میں کرنا۔" جویریہ نے اسے ٹوکا۔

"بھئی ویسے تو ہم لوگ draughting manual کرتے ہیں۔ لیکن Autocad ایک بنا بنایا salt ware pakage ہے۔ جس کی مدد سے ہم کمپیوٹر پر کم وقت میں اور زیادہ accuracy کے ساتھ اپنی drawings بنا سکتے ہیں۔" فریال نے کاجو منہ میں ڈالتے جواب دیا۔

"اچھا تو کزن صاحب کا اس میں کیا ذکر ہے؟" عظمیٰ نے دریافت کیا۔ وہ وہیں سائڈ ٹیبل پر رکھی الیکٹرک کیتلی میں ان لوگوں کے لیے کافی بنا رہی تھی۔

"بتاتی ہوں۔ اصل میں ہمیں اپنی پڑھائی میں ان دنوں autocad سیکھنے کی شدید ضرورت ہے۔ میرے تمام کلاس فیلوز وغیرہ نے autocad 2D اور 3D دونوں سیکھ لیے ہیں۔ بس ہم چار پانچ نکمیاں ہی رہ گئی ہیں۔ تمام کلاس فیلوز نے بھی اور کچھ ٹیچرز نے بھی ایک انسٹیٹیوٹ کی بہت تعریفیں کیں۔ زیادہ تر اسٹوڈنٹس وہیں سے کورس کر کے آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ بعض ٹیچرز بھی جنہوں نے پہلے سے کورس کیا ہوا تھا، اسی انسٹیٹیوٹ سے ریفریشر کورس کر کے آئے۔ ہمیں بھی وہیں جانے کا مشورہ دیا گیا تو میں، حنا، نفسہ اور زیبا آج وہاں پہنچ ہی گئے۔ بہادر آباد میں بڑا شاندار سا انسٹیٹیوٹ ہے وہ جس کے مالک ان محترمہ کے کزن حسن عباس صاحب ہیں۔ اسے کبھی توفیق نہ ہوئی کہ دوستوں کو بتا دیتی کہ سکھیوں کو کمپیوٹر کورس کرنا ہو تو اپنے گھر ہی کا انسٹی ٹیوٹ ہے، وہاں سے رجوع کرو۔" فریال نے بات ختم کر کے آخر میں اسے پچکارا۔

وہ چپ چاپ اس کی باتیں سن رہی تھی۔ عظمیٰ نے کافی کے مگ ان لوگوں کے ہاتھوں میں پکڑائے تو عائشہ پوچھنے لگی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ انسٹی ٹیوٹ اس کے کزن کا ہے؟"

"مجھے کیسے پتا چلتا۔ ہم لوگ تو وہاں ریسیپشن سے فارم اور پراسپکٹس لے رہے تھے جب وہ ہمارے پاس سے کسی سے بات کرتا ہوا گزرا۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام دعا کی۔ پہلے تو وہ پہچانا نہیں۔ پھر جب فاطمہ کا حوالہ دیا تو پہچان گیا۔ پھر تو گیا وی آئی پی سلوک ہمارے ساتھ ہوا۔ میں بتا نہیں سکتی۔ ہمیں بڑے عزت اور احترام سے اپنے شاندار سے آفس میں لے جا کر بٹھایا گیا۔ مزے دار سی چائے پلوائی گئی۔ میری فرینڈز بھی اس خاص سلوک پر حیران ہو رہی تھیں۔ میں نے یونہی مذاق میں کہہ دیا کہ تعلقات کے حوالے سے آپ کو ہم سے فیس میں کچھ رعایت کرنی چاہیے۔ اس وقت تو وہ مسکرا کر چپ ہو گیا مگر جب باہر آ کر ہم لوگوں نے فارم جمع کروایا تو اکاؤنٹینٹ صاحب نے ہم سے فی لڑکی ساڑھے سات ہزار کی جگہ پانچ ہزار روپے وصول کیے تو میری دوستیں خوشی سے پاگل ہو گئیں۔"

فریال کے بات ختم کرنے کی دیر تھی۔ وہ سب نہایت معنی خیز مسکراہٹ سے اسے دیکھنے لگیں۔ وہ ان لوگوں کی مسکراہٹ نظر انداز کر کے فریال سے پوچھنے لگی۔

"کتنے دنوں کا کورس ہے؟"

"ایک مہینے کا کورس ہے۔ ہفتے میں تین دن کلاس ہو گی۔ سنا ہے وہاں کے سارے انسٹرکٹرز فریش گریجویٹ اور بڑے ہینڈسم اور اسمارٹ ہیں۔ ویسے تمہارے کزن صاحب خود کلاس نہیں لیتے۔ بتا رہے تھے کہ وہ صرف دو تین گھنٹوں کے لیے وہاں آتے ہیں۔ باقی وقت کہیں اور مصروف ہوتے ہیں۔ میری دوستیں کہہ رہی تھیں جس کی غیر موجودگی اتنے معنی رکھتی ہے۔ اگر وہ ساتھ ہوتی تو شاید ہم مفت ہی کورس کر لیتے۔"

فریال دوبارہ پٹڑی سے اتری تو وہ ناراض لہجے میں بولی "فضول باتیں مت کیا کرو۔"

جویریہ اس کی ناراضی محسوس کر کے موضوع بدل گئی "اور کون کون سے کورسز وہاں کروائے جاتے ہیں۔"

"بھئی ہر قسم کے Dos اور windows کے حوالے سے تمام کورسز ہی وہاں ہوتے ہیں۔ بہت

اچھی ریپوٹیشن ہے وہاں کی۔ ہمارے ہاں کے تو تمام اسٹوڈنٹ جوق در جوق وہیں جا رہے ہیں۔"
رات سونے کے لیے لیٹی تو عجیب سا دکھ اسے اپنی لپیٹ میں لے گیا۔ کبھی ہم کتنے قریب تھے۔ ایک دوسرے کی ہر خوشی اور ہر دکھ شیئر کرتے تھے۔ اسے اس کے بی سی ایس کرنے پر اس کے ساتھ جا کر آئس کریم کھانا یاد آیا تو خوامخواہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ آج اتنے اجنبی اور ایک دوسرے سے اتنی دور۔ ہاں تمہاری نظروں میں میری اوقات ہی کیا ہے۔ جو تم مجھ سے اپنی کوئی خوشی یا کامیابی شیئر کرو۔ میں تو تمہارے راستے کی دھول ہوں۔ ایک گلے پڑا ڈھول جسے تم بجانے پر مجبور ہو۔ اسے اپنا اداس ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر وہ اپنی اس کیفیت سے پیچھا بھی نہیں چھڑا پا رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

فریال کو برٹش لائبریری میں اپنے کچھ نوٹس بنانے تھے۔ وہ اتفاق سے فارغ تھی اور جویریہ وغیرہ کے نہ ہونے پر بور بھی ہو رہی تھی سو اس کے ساتھ چلی آئی۔ جتنی دیر وہ نوٹس بناتی رہی' وہ اپنی پسند کے موضوعات پر کتابیں دیکھتی رہی۔ واپسی میں فریال نے اس سے کہا۔
"مجھے بلال صاحب سے سی ڈی لینی ہے۔ اگر تمہیں دیر نہ ہو رہی ہو تو پہلے انسٹیٹیوٹ چلیں۔" وہ اپنے انسٹیٹیوٹ کا نام لے کر بولی تو اس نے سر ہلا دیا۔
گاڑی انسٹیٹیوٹ کے سامنے روک کر وہ اسے دو منٹ انتظار کرنے کا کہہ کر اندر چلی گئی تو وہ اس شاندار سی جگہ کو دیکھنے لگی' جس کے ماتھے پر اس کی ماں کے نام کی تختی لگی تھی۔ اسی وقت فریال کی گاڑی کے ٹکے آ کر ایک بلیک سوک رکی۔ اس میں سے اترتے حسن کو دیکھ کر اسے کوئی حیرت نہ ہوئی مگر برابر والی طرف کا دروازہ کھول کر اترتی اس بے تحاشا خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ بے حد خوب صورتی عطا کرتا ہے۔ وہ ان ہی لوگوں میں سے تھی۔ اسے شاید اپنے اس حد سے بڑھے ہوئے حسن کا بے حد احساس بھی تھا اس لیے انداز میں ایک عجیب سی شان بے نیازی محسوس ہو رہی تھی۔ شانوں پر لہراتے سلکی براؤن بال جنہیں وہ بڑی ادا سے جھٹک کر پیچھے کر رہی تھی۔ سلیقے سے کیے میک اپ نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ نرم و نازک سراپے پر وہ خوب صورت اور دیدہ زیب ہرے رنگ کا لباس شاید بنا ہی اس کے لیے تھا۔ گاڑی سے اترتی وہ حسن سے کچھ بولتی مسکرائی تو اس کے گالوں میں پڑنے والے ڈمپل کو دیکھ کر شاید کچھ دیر کو وہ بھی اسی کی طرح مبہوت رہ گیا ہو گا۔ اسے اپنے آس پاس عجیب سا سناٹا پھیلتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ حسن کو نظر نہ آئے' وہ اسے دیکھے بغیر اندر چلا جائے۔ مگر اس کی اس سے پہلے کون سی خواہشات پوری ہوئی تھیں جو یہ ہوتی۔
اسے جواب دے کر وہ جونہی مڑا۔ اس کی نظر سیدھی اسی پر پڑی۔ ایک لمحے کو کچھ حیران سا ہو کر وہ اس کے پاس چلا آیا۔
"تم یہاں؟" وہ سوالیہ انداز میں بولا۔ اس کے پیچھے کھڑی وہ لڑکی بھی اسی طرف چلی آئی تھی۔
"میری فرینڈ کو یہاں کچھ کام تھا۔ میں اس کا ویٹ کر رہی ہوں۔" اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔
"تو باہر کیوں بیٹھی ہو۔ اندر چلو نا۔" وہ مسکرایا تھا۔ اس سے دو قدم پیچھے کھڑی وہ لڑکی اب کچھ بیزار ہونے لگی تھی۔
"نہیں' وہ بس آنے والی ہے۔ اسے ایک دو منٹ ہی اور لگیں گے۔" وہ اس پر ایک نظر ڈال کر دوبارہ روڈ پر نظریں دوڑانے لگی۔
"چلو حسن! دیر ہو رہی ہے۔" وہ اسے خاطر میں لائے بغیر اپنے ساتھ کھڑے شاندار بندے سے مخاطب ہوئی تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
"میں تعارف تو کرانا بھول گیا۔ یہ فاطمہ ہے میری کزن اور یہ شفق ہیں۔"
"ہیلو۔" اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر شفق نے ہیلو کہا تو جواب میں اس نے بھی "ہیلو" کہنے پر اکتفا کیا۔
"حسن! یہ تمہاری وہی کزن ہیں جو ہاسٹل میں رہتی ہیں؟" بظاہر اس سیدھے سادے سوال کے پیچھے چھپے معنی وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ شاید وہ کہنا تو یہ چاہتی ہو گی کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا کوئی گھر نہیں جو لاوارث ہے مگر شوگر کوٹنگ کر کے لفظوں کو میٹھا کیا گیا تھا۔
"جی ہاں' میں وہی کزن ہوں۔" اس نے خود اعتمادی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر جواب دیا۔ وہ جو اپنی بات کا جواب حاصل کرنے کے لیے حسن کی طرف دیکھ رہی تھی بڑے غصے سے اس لڑکی کو دیکھنے لگی جو بڑی معمولی سی تھی۔ حسن نے چونک کر اسے دیکھا جو اس غرور سے تنے سوالی کو جواب دے کر اب روڈ پر دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت فریال تیز قدموں سے چلتی ان لوگوں کے پاس آ گئی اور حسن اور شفق سے ہائے ہیلو کرتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ دونوں اس کے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اندر جا چکے تھے۔
"دیکھا تم نے شفق شاد کو؟" فریال نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد کہا۔
اس کے کچھ کہنے سے پہلے وہ خود ہی مزید بولی۔ "چلو مان لیا کہ آپ بہت خوب صورت ہیں مگر یہ محترمہ تو خود کو کچھ زیادہ ہی اونچی شے سمجھتی ہیں۔ ذرا سی کیٹ سے شکل کیا ملتی ہے خود کو سچ مچ کی کیٹ ونسلیٹ سمجھنے لگی ہے۔ تم ذرا خیال رکھنا' تمہارے کزن صاحب کے آج کل کچھ زیادہ ہی پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو' وہ کیٹ اصل کی روز بن جائے اور تمہارا کزن جیک اور تم دیکھتی رہ جاؤ۔"
"تمہیں سی ڈی مل گئی۔" اس کی بات کے جواب میں فاطمہ نے کہا تو وہ بھی اس ذکر کو بھول اپنی سی ڈی کی باتیں کرنے لگی۔ موضوع بدل جانے پر اس نے سکون کا سانس لیا۔
اپنے کمرے میں آ کر وہ پتا نہیں کیوں آئینے کے سامنے کھڑی خود کو کتنی دیر تک دیکھتی رہی۔ بغیر کسی بناؤ سنگھار کے دھلا دھلایا چہرہ' حالات سے لڑتی اور جدوجہد سے بھرپور زندگی گزارنے کی گواہ تھکی ہوئی بوجھل آنکھیں۔ شاید وہ بھی خوب صورت لگ سکتی تھی اگر قیمتی ملبوسات پہنتی۔ بہترین کاسمیٹکس استعمال کرتی اور اگر زندگی اس پر یوں تنگ نہ ہوتی۔ وہ نو ہزار ماہوار کمانے والی' دیگنوں کے دھکے کھاتی بے حد معمولی لڑکی جس کا حوالہ یہ تھا کہ وہ بے گھر ہے۔ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اس کے پاپا شفق شاد کے پاپا کی طرح کوئی بہت بڑے ایڈر نہیں۔ اس رات تکیے میں منہ چھپا کر وہ کتنی ہی دیر روتی رہی تھی۔
اگلے روز اتوار تھا اور اسے اپنا تماشا لگوانے کا کوئی شوق نہیں تھا اس لیے فریال کے ساتھ اس کے ماموں کے گھر چلی آئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی روئی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر وہ کسی خوش فہمی کا شکار ہو۔ فریال کے ماموں' ممانی اور ان کے دونوں بچے جو بے حد شرارتی تھے' ان کے ساتھ سارا دن گزار کر واپس آئی تو کسی سے پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ وہ آیا تھا یا نہیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

جویریہ نے اپنے کولیگ مصطفیٰ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو وہ سب کی سب بے حد خوش ہوئیں۔ اسے خاص طور پر بہت خوشی ہوئی تھی وہ اس کی پیاری سہیلی جو ہر مشکل میں اس کے کام آئی تھی اور جس کو دیکھ کر اس نے زندہ رہنے کا ڈھنگ سیکھا تھا۔ اس کی خوشی درحقیقت اس کی اپنی خوشی تھی۔ اس کی مبارک باد کے جواب میں وہ بولی تھی۔
"لوگ صحیح کہتے ہیں کہ شادی ایک جوا ہے اور میں یہ جوا ایک مرتبہ پھر کھیل رہی ہوں۔ لیکن اس بار میں نے کسی سے بھی کوئی توقعات وابستہ نہیں کیں۔ اس لیے اگر کوئی دکھ اٹھانا پڑا تو سہہ لوں گی۔ ہم جب تک دوسروں سے امیدیں رکھتے ہیں۔ اس وقت تک ناخوش رہتے ہیں۔ میں کسی سے بھی کوئی امید' کوئی آس نہیں رکھتی۔ اسی لیے دیکھ لو' کتنی خوش رہتی ہوں۔"

دنیا دکھاوے کے لیے اس کے بھائیوں نے بھی اس موقع پر آگے بڑھ کر اپنے گھر سے بہن کو رخصت کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس کے ہاسٹل سے بڑے بھائی کے گھر شفٹ ہونے سے پہلے آخری دن ان چاروں نے اسے پرائیویٹ میں فیئرویل پارٹی دینے کا پروگرام بنایا۔

وہ پانچوں ہنستی مسکراتی فریال کی گاڑی میں ٹھنس ٹھنسا کر پرائیویٹ پہنچیں۔ سب نے تیاری بھی خوب دل لگا کر کی تھی کہ واپسی میں تصویریں کھینچنے کا پروگرام تھا۔ پزا سے انصاف کرتے وہ سب ہنسنا بے فکری سے ہنسنے اور باتیں کرنے میں مشغول تھیں۔ خوب چھینا جھپٹی ہو رہی تھی۔

"ہمارے گروپ میں بس اب یہ فاطمہ بی بی ہی بچی ہیں باقی تو سب خیر سے فارغ ہو گئیں۔" عائشہ نے بڑا سا نوالہ لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں یہ فریال بھی تو ہے۔" عظمیٰ نے نکتہ اعتراض اٹھایا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ سنا نہیں آج کل بلال صاحب اسے ہنٹس سی ڈی فراہم کر رہے ہیں۔ جس دن کا اس آف ہوتی ہے اس دن بھی بڑا دل لگا کر ایکسٹرا پڑھاتے ہیں۔"

عائشہ نے شرارت سے کہا تو فریال بری طرح جھینپ گئی۔ جبکہ وہ سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھیں۔ ان لوگوں کی ہنسی سے تنگ آ کر وہ اپنی جھینپ مٹانے کو اس پر الٹ پڑی۔

"تمہیں بڑی ہنسی آ رہی ہے۔ ایسے تو میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ فاطمہ بیگم کی فکر کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں آخر کزن صاحب تو موجود ہیں۔"

"بھئی میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا جو میرے پیچھے پڑ رہی ہو۔ بہتر ہو گا کہ اپنی توپوں کا رخ اس موٹی تک ہی رکھو۔"

اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔ اپنے موٹی کہے جانے پر عائشہ صدمے سے پاگل ہونے لگی۔

"تم مجھے موٹی کہہ رہی ہو؟"

"میں نہیں' وہ اے سی صاحب فرما رہے تھے اس روز۔" اس نے عائشہ کو چھیڑا۔

"اچھا اس روز جب آپ کے کزن صاحب نے کے ایف سی میں آپ کو دعوت دی تھی۔" عائشہ جل کر بولی۔ وہ جواب میں مسکرا دی۔

"تم بس بیٹھ کر مسکراتی رہنا اور وہ کیٹ ونسلیٹ دیکھ لینا۔ لے اڑے گی اسے۔" فریال نے اسے ڈانٹا۔ وہ سب بھی کیونکہ غائبانہ شفق شاہ سے واقف تھیں اس لیے سب ہی شروع ہو گئیں۔

"میں تمہاری جگہ ہوتی اور ساری دنیا کی حسینائیں بھی آ جاتیں جن میں میڈونا' بروک شیلڈز' ایشوریا' سشمیتا' ڈایانا' جولیا رابرٹ' کیٹ اور الارا وتا ہی کیوں نہ شامل ہوتیں۔ اپنا حق کسی کو اتنی آسانی سے ہرگز نہ لے جانے دیتی۔" عائشہ نے اسے غیرت دلانے کی کوشش کی۔

"تم پر تو وہ مثال فٹ بیٹھتی ہے کہ روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا۔ لڑکی کچھ کرو۔ نہیں تو تمہارا ٹائی ٹینک ڈوب جائے گا۔" عظمیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر اسے کوئی کیٹ پسند آ گئی ہے تو ہم آپ کیا کر سکتے ہیں سوائے صبر کے۔" وہ ان لوگوں کی اوٹ پٹانگ باتوں پر ناراض ہونے کے بجائے اطمینان سے بولی۔ اس کے کیٹ کہنے پر وہ سب ہی ہنس رہی تھیں۔

"تمہیں اس سے جیلسی تو فیل ہوتی ہو گی؟"

جویریہ پہلی مرتبہ اس موضوع پر بولی۔

"اصل میں تم لوگوں کا اللہ تمہارا کزن اور ہائے تمہارا کزن' سن سن کر میرے کان پک چکے ہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے آج میں صاف صاف اپنے خیالات بتا ہی دوں۔"

وہ ان لوگوں کی حیرت کے جواب میں بولی۔

"اب تم کوئی جھوٹ کا پلندہ سناؤ گی۔ جی میں تو اسے اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ تم لوگوں کی تو ذہنیت ہی خراب ہے' وغیرہ وغیرہ۔" فریال نے اس کے انداز کی نقل اتارتے ہوئے کہا تو وہ سب ہی تائید کرنے لگیں۔

"اتنے ہینڈسم بندے کو کوئی پاگل لڑکی ہی اپنا بھائی بنائے گی۔ جبکہ وہ بے حد کوالیفائڈ اور ریفائنڈ بھی ہو۔" عظمیٰ نے فیصلہ سنایا۔

"وہ بہت ہینڈسم ہو سکتا ہے' بہت کوالیفائڈ بھی اور شاید ایک کامیاب اگزیکٹو بھی مگر کم از کم ایک اچھا انسان ہرگز نہیں ہے اور میرے لیے کسی آدمی کا اچھا ہونا یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھا انسان ضرور ہو اور جو ایسا نہیں ہے تو وہ چاہے مائکروسافٹ کا چیئرمین ہو یا بل کلنٹن' میں اسے کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں۔"

اس کی بات پر وہ سب حیران رہ گئیں۔

"ایسے تو مت کہو۔ اتنا اچھا تو ہے بے چارہ۔ تمہارا کتنا خیال رکھتا ہے اب تو اس کا ہر سنڈے کو ہاسٹل آنا بالکل اسی طرح کا Universal truth (عالمگیر سچائی) بن چکا ہے جیسے زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے یا سورج مشرق سے نکلتا ہے اتنے عرصے میں مجال ہے' وہ بندہ کبھی ایک سنڈے غائب ہوا ہو۔" عائشہ نے اس کی بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔

"وہ کوئی اور بات ہے جو تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بہرحال موصوف میرے عشق میں مبتلا ہو کر یہاں ہرگز نہیں آتے۔" اس نے پیپسی پیتے ہوئے جواب دیا۔

"اور جو تمہاری وجہ سے ان لوگوں کی فیس معاف کی تھی وہ۔" جویریہ نے ایک اور پوائنٹ اٹھایا۔

"آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے بتا دوں' میری وجہ سے نہیں ان لوگوں کی اپنی وجہ سے۔ دنیا کے تمام ہی مرد گھر کے باہر ملنے والی خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ اتنے ہی نرم دل ہوتے ہیں۔ جب کہ وہ لڑکیاں اس کی اسمارٹ نیس پر بری طرح فدا ہو کر اسے آسمان پر بھی چڑھا رہی ہوں۔ درحقیقت اسی قسم کی باتوں اور تعریفوں نے موصوف کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا ہے اور اب ہم آپ تو انہیں معمولی کیڑے مکوڑے نظر آتے ہیں۔"

اس کی بات پر فریال کو سب سے زیادہ غصہ آیا۔

"شرم کرو' وہ تمہارا کزن ہے۔ جس کے بارے میں تم یہ فضول بکواس کر رہی ہو۔"

"کزن ہے تو کیا ہوا۔ انسان کو سچ بولنے کی ابتدا اپنے گھر ہی سے کرنی چاہیے۔" اس کی بے نیازی قابل دید تھی۔

"اور جس کیٹ کا تم غم منا رہی ہو۔ وہ کبھی بھی اس سے شادی نہیں کرے گا۔ شادی کے لیے تو کوئی بھولی بھالی معصوم سی لڑکی منتخب کی جائے گی۔ یہ مرد کبھی بھی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرتے جو پہلے ہی آزادانہ ان کے ساتھ گھومتی پھرتی ہو۔" اس نے سکون سے اپنی بات مکمل کی۔

"تمہیں بہت مردوں کا تجربہ ہے۔" عائشہ کو غصہ آیا آخر اے سی صاحب بھی تو مرد ہی تھے۔

"میں ان لوگوں میں سے ہوں جو خود تجربات کرنے کے بجائے دوسروں کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو نقصان پہنچنے سے بچا لیتے ہیں۔ ابھی ہوا اے سی شہریار درانی ہر ہفتے دوڑیں لگاتے پہنچ رہے ہیں' بعد میں تمہارا منہ انہیں نہیں منہ لگا کرے گا اور بلال صاحب تم سے اپنی ایک ایک سی ڈی کا حساب طلب کریں گے۔"

وہ آج ان لوگوں سے اگلے پچھلے تمام حساب چکانے کے موڈ میں تھی۔ اس کی اس بات پر فریال اور عائشہ ایک ساتھ بولنا شروع ہو گئیں۔

"ارے اس نے مسز ہاشمی کا گروپ جوائن کر لیا ہے' وہ کل ہی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ مرد اگر بیٹے تو ہے پر بھی ہاتھ رکھ کر کہے کہ تم سے محبت کرتا ہے تو بھی یقین نہ کرو۔"

"میں نے کوئی گروپ وروپ جوائن نہیں کیا۔ ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ اتنی ناقص العقل خواتین کے لیے جو زبانوں اور آنکھوں کے جھوٹے قصیدوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی ہوں' کون اپنا ہاتھ جلائے۔ پھر یہ تال کا خرچا الگ۔ لہٰذا یہ تو ے والی مثال نہایت بھونڈی ہے۔" وہ نہایت اطمینان سے بولی تو جویریہ اس کے ساتھ مل گئی۔

"اس بات پر تو میں بھی فاطمہ کی تائید کروں گی۔ مرد

سے زیادہ جھوٹا، مکار اور بے وفا اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں ہوگا۔"

"شکریہ میرے حق میں بولنے کا۔ اب یہ سامنے والی میز پر ہی دیکھو۔ وہ ستر سالہ بڑے میاں اپنے پہلو میں پوتی کی عمر کے برابر کی لڑکی کو بٹھائے خود کو پرنس آف ویلز سمجھ رہے ہیں اور پوتی صاحبہ کی طرف دیکھتے ہم لوگوں کو دیکھنا بھی نہیں بھول رہے۔" اس نے سامنے والی میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو عظمیٰ کہنے لگی۔

"سب سے زیادہ غور سے دیکھ بھی تمہیں ہی رہے ہیں۔ یہ بلیک کلر تم پر سوٹ بھی تو بہت کر رہا ہے اور پھر یہ میک اپ۔"

"ویسے یہ ٹھیک ہے کہ آج ہم سب میں سب سے اچھی تم لگ رہی ہو۔" فریال نے بھی تعریفی کلمات کہے۔

"شکریہ بہت شکریہ۔" اس نے بڑے میاں کی طرف سے اپنا رخ اس طرح موڑا کہ اب اس کا سائڈ پوز ہی بمشکل دیکھ پا رہے ہوں گے۔

"کیا خیال ہے جاتے ہوئے ذرا تفریح کریں گے۔ بڑے میاں کے پاس جا کر کہیں گے کہ انکل آپ کی پوتی کا کہیں رشتہ تو نہیں طے ہوا۔ مجھے اپنے بھائی کے لیے یہ بہت پسند آئی ہیں۔" فریال جیسی ہنگامہ پرور لڑکی ایسی شرارتوں کی ہمیشہ روحِ رواں ہوتی تھی۔

"خیال تو برا نہیں۔" عائشہ نے بھی تائید کی۔ "ہم سب میں سب سے سنجیدہ جویریہ اور فاطمہ ہی ہیں لہٰذا ان دونوں ہی میں سے کوئی بڑے میاں سے جا کر بات کرے۔ میں تو بات بعد میں کروں گی، ہنسی پہلے آجائے گی۔" فریال نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"میں تو کبھی بھی نہ جاؤں اس خبیث بڈھے کے پاس۔ تم لوگ کرو اپنا انجوائے منٹ، میں اور جویریہ تو گاڑی میں جا کر بیٹھ رہے ہیں۔"

اس نے صاف انکار کیا اور فوراً کھڑی ہو گئی۔ کھڑے ہوتے ہوئے اپنی پچھلی میز پر نظر پڑی تو اس کے اوسان جاتے رہے۔ حسن اور تین دوسرے افراد ان کے بالکل پچھلی والی میز پر بیٹھے تھے۔ وہ لوگ اپنی باتوں میں کچھ اس طرح مشغول تھیں کہ گرد و پیش کا کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ حسن تو سنجیدہ چہرے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مگر وہ تینوں بڑی دلچسپی سے اس بنی سنوری لڑکی کو دیکھ رہے تھے جو مردوں کے خلاف مسلسل اپنی دوستوں کی برین واشنگ کرتی رہی تھی۔ اسے اٹھتا دیکھ کر بھی ان میں سے کسی نے اس پر سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی جویریہ اور عظمیٰ بھی اٹھ گئیں اور فوراً ہی وہ دونوں بھی اسی کی طرح بت بن گئیں۔

"تم تینوں کو کیا سانپ سونگھ گیا؟" انہیں ہکا بکا کھڑے دیکھ کر فریال بھی اٹھ گئی تو اس کا بھی یہی حال ہوا۔

زندگی میں پہلی ہی مرتبہ اس کے بارے میں کوئی کمنٹس دیے تھے اور پہلی ہی بار پکڑی بھی گئی تھی۔ ان لوگوں کو وہیں بت بنا چھوڑ کر وہ باہر نکلنے والے راستے پر چل پڑی۔

کچھ دیر بعد وہ چاروں بھی آکر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

"کتنا برا ہوا۔ ہم لوگوں کو بولتے وقت آس پاس دیکھ تو لینا چاہیے تھا۔" جویریہ نے افسوس کا اظہار کیا۔

"مجھے تو اتنی شرمندگی ہو رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔ کیا امپریشن پڑا ہوگا اس کا ہم لوگوں کے بارے میں۔" عظمیٰ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

"تم لوگوں سے زیادہ شرمندگی تو مجھے اٹھانا پڑے گی۔ انسٹی ٹیوٹ میں اب اگر کبھی اس کا سامنا ہو گیا تو کتنی شرمندگی ہوگی۔"

فریال کی بات پر وہ جو اتنی دیر سے چپ بیٹھی تھی بول پڑی "کس بات کی شرمندگی۔ ہم آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں۔ جس کے بارے میں جو چاہیں بول سکتے ہیں۔"

"پھر بھی اس نے کیا سوچا ہو گا؟" عائشہ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"جو چاہے سمجھتا رہے ہماری بلا سے اور تم لوگوں کا افسوس تو ویسے بھی بڑا فضول ہے۔ تمہیں کیا اس سے

رشتے داری جوڑنی ہے یا کوئی پلاٹ پرمٹ وغیرہ حاصل کرنا ہے جو ایسی ٹیکنیکس بنا رہی ہو۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

ان لوگوں کو تو ٹوک دیا تھا اور خود اپنے آپ سے بھی کہہ دیا تھا "آئی ڈونٹ کیئر" لیکن اتوار کے روز صبح ہی سے وہ سخت کونشیس ہو رہی تھی۔ کسی کو ڈسکس کرنا چاہے برے انداز ہی میں سہی اس بات کو تو بہرحال ظاہر کرتا ہے کہ آپ اس شخصیت کو اہمیت دے رہے ہیں اور وہ نادانستگی میں اسے اہمیت دے گئی تھی۔ وہ تو یہی سمجھا ہوگا کہ میں اکثر ہی فرینڈز میں بیٹھ کر اسے ڈسکس کرتی ہوں۔

اس کی آمد کی اطلاع پا کر وہ مرے مرے قدموں سے چلتی ویٹرز روم میں داخل ہوئی۔

"السلام علیکم۔" اس نے سوچ لیا تھا کہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اسی لیے اطمینان سے کھڑی تھی۔

"وعلیکم سلام۔ کہیں جا رہی ہو؟" اس نے گہری نگاہوں سے ان کا جائزہ لیا۔

"جی آج جویریہ کی مہندی ہے۔ وہیں جانا ہے۔" اپنے مہندی کلر کے کامدانی کے دوپٹے کو سنبھالتے جواب دیا گیا۔

"کیسے جاؤ گی۔ میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

"نہیں شکریہ، ہم لوگ فریال کی گاڑی میں جائیں گے۔" وہ اس کی خود پر مرکوز نگاہوں سے کچھ بے چین سی ہو کر بولی۔

"اچھا پھر میں چلتا ہوں۔" وہ کھڑا ہو گیا تو فاطمہ بھی اٹھ گئی۔

اپنے کمرے میں واپس آئی تو وہ تینوں اسی کے کمرے میں بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھیں "کیا ہوا؟ کچھ کہا اس نے تم سے؟" سب نے ایک آواز ہو کر سوال کیا تو وہ ہنس پڑی۔

"وہ ہم لوگوں کی طرح فارغ نہیں جو اتنی فالتو باتیں یاد رکھے ویسے بھی بڑے دماغ کے لوگ اتنی چھوٹی باتوں پر کوئی رائے دینا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔" اس کے جواب پر وہ لوگ مایوس ہو گئیں۔ "میرا تو خیال تھا کہ وہ کیٹ کے حوالے سے تمام غلط فہمیاں دور کر کے شاید آج تمہیں پروپوز کر دے۔" فریال نے منہ بنایا۔

کچھ دیر وہ تینوں اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتی رہیں۔ پھر جب سب کی تیاری مکمل ہو گئی تو وہ جویریہ کے بھائی کے گھر جانے کے لیے گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ مسز کاظمی کی اجازت سے وہ چاروں ہی جویریہ کی شادی کے دن تک اس کے بھائی کے گھر ٹھہریں۔ جویریہ کی شادی کے تمام فنکشنز کو ان لوگوں نے بہت انجوائے کیا۔ مصطفیٰ بھی سب کو اچھا لگا تھا۔ سیدھا سادہ، پڑھا لکھا شخص۔ اس کی شخصیت میں دکھاوا اور بناوٹ بالکل نہیں تھی۔ اپنی دوست کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر کے وہ لوگ واپس ہاسٹل آگئیں۔

جویریہ کی کمی سب سے زیادہ اسی کو محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی اس کے کمرے میں کوئی اور لڑکی نہیں آئی تھی۔ مگر اسے پتا تھا کہ کوئی اور لڑکی آ بھی گئی تو کبھی بھی جویریہ کی جگہ نہیں لے سکے گی۔ وہ مخلص اور محبت کرنے والی لڑکی جو ہر ہر قدم اس کے کام آئی تھی اور کبھی کوئی احسان بھی نہیں جتایا تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی نہیں لے سکتا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

جویریہ کو مس کرتی وہ ان دنوں کچھ زیادہ ہی اداس رہنے لگی تھی۔ اس شام فریال اس کے کمرے میں آئی "مجھے آفس جانا ہے۔ تم چل رہی ہو میرے ساتھ۔" اپنی بوریت دور کرنے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ چلی آئی۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ یونہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتی رہیں۔ موسم بھی اچھا تھا اور پھر گاڑی اور پیٹرول بھی اپنا تھا سو فریال بی بی بڑے موڈ میں فاسٹ ڈرائیونگ کر رہی تھیں۔

"شاہراہ فیصل جیسی صاف ستھری سڑک پر گاڑی چلانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔" فریال نے ڈرائیونگ کو انجوائے کرتے ہوئے کہا۔

"ایسا کرتے ہیں کچھ دیر ڈرائیو کر کے کہیں سے مزے دار سا برگر اور آئس کریم کھاتے ہیں۔" اس نے لب کشائی کی۔

"آئیڈیا اچھا ہے۔ لیکن بل تم پے کرو گی۔" فریال کی بات پر وہ ہنس پڑی۔ یونہی ڈرائیو کرتے کچھ دیر گزری ہو گی جب اس کے پاس سے ایک گاڑی تیز رفتاری سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔ ایک لمحے سے بھی کم وقفے میں وہ پہچان چکی تھی کہ یہ بلیک سوک کس کی ہے اور برابر والی سیٹ پر بیٹھی لڑکی کون ہے۔ گاڑی ایف بی سی کے سامنے جا کر رک گئی تھی۔ سو وہ بے ساختہ فریال سے بولی۔

"فریال! ذرا یہاں ایف بی سی کے پاس گاڑی روکو۔ مجھے اپنی ایک پرانی دوست اندر جاتی نظر آئی ہے۔"

شام کے پانچ بج رہے تھے اور بیشتر دفاتر کی اس وقت چھٹی ہوئی تھی۔ ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ فریال کو گاڑی ایف بی سی سے تھوڑی پہلے ہی روک دینی پڑی۔

"رش بہت ہے۔ گاڑی پھنس گئی تو میری ڈرائیونگ اتنی عالی شان بھی نہیں کہ ٹریفک کے ہجوم سے نکال سکوں۔"

فریال بھی اس کے ساتھ ہی گاڑی سے اترتے ہوئے بولی۔ سامنے سے آتے بلال کو دیکھ کر فریال اس سے ہائے ہیلو میں مصروف ہو گئی۔ وہ ان لوگوں کے گاڑی روکنے سے بھی کافی پہلے اندر جا چکا تھا۔ جبکہ شفق گاڑی ہی میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ فریال کی گاڑی اس کی گاڑی سے بہت دور کھڑی تھی' اس لیے اتنے رش میں اسے اپنے دیکھ لیے جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے واپس آتا نظر آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے اس نے کسی بھی طرف دیکھے بغیر گاڑی اسٹارٹ کر دی تو وہ فریال کی طرف متوجہ ہوئی جو گرد و پیش سے بے نیاز بلال سے باتوں میں مگن تھی۔

"فریال! میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔" اس نے اسے مخاطب کیا تو وہ مصروف انداز میں بولی۔

"ہاں ہاں' جاؤ' کوئی بات نہیں۔" اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے مگر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اندر جائے اپنے دل کی مانتی وہ اندر چلی آئی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ یونہی کسی کام سے یا کسی سے ملنے یہاں آیا ہو مگر اسے لگ رہا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ کچھ ہی دیر بعد اس کے شبے کی تصدیق ہو گئی تھی۔

ذرا سی کوشش کے بعد وہ ایف بی سی کے فورتھ فلور پر واقع اس چھ کمروں کے شاندار دفتر میں کھڑی تھی۔ جو اس کے کزن حسن عباس کا تھا اور جہاں سے مختلف فرمز' بینکوں اور دیگر کاروباری اداروں کو کمپیوٹر سسٹم فروخت کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر سسٹمز ڈیزائن کرنا اور سافٹ ویئر اور ہارڈ ویئر سے متعلق تمام امور میں بھی یہیں ڈیل کیا جاتا تھا۔ وہ ایک سرسری سی نظر وہاں ڈال کر باہر نکل آئی۔ وہاں پر واقع بہت سے دفتروں میں سے مختلف لوگ آف ہونے پر نکل رہے تھے۔ اسی لیے گہما گہمی اور شور شرابا کچھ زیادہ ہی تھا۔ اسی وقت اس نے اپنے سے آگے چلتی دو لڑکیوں کو باتیں کرتا سنا۔

"یہ حسن عباس آج کل شفق شاہ کے ساتھ کچھ زیادہ ہی دیکھے جا رہے ہیں۔" ان میں سے ایک بولی تھی۔ دونوں ہی ملازمت پیشہ معلوم ہو رہی تھیں۔

"ساتھ ساتھ کیا میں نے تو سنا ہے کہ ان لوگوں کی انگیجمنٹ بھی ہو گئی ہے۔ وہ حرا نہیں ہے جو حسن عباس کے ہاں ٹیلی فون آپریٹر ہے' مجھے بتا رہی تھی کہ شاید اگلے مہینے وہ دونوں شادی کرنے والے ہیں۔" دوسری نے جواب دیا تو پہلی مسکراتے ہوئے بولی۔

"خیر کپل تو اچھا ہے۔ دونوں ایک ساتھ اچھے لگتے ہیں۔"

وہ دونوں ہنستی مسکراتی باتیں کرتی کافی دور جا چکی تھیں جبکہ وہ وہیں کھڑی تھی۔ پتا نہیں بعض دفعہ آپ جن باتوں کے ہونے سے پہلے ہی ان سے واقف ہوتے ہیں اور آپ کو اس بات کی کچھ خاص پروا بھی نہیں ہوتی مگر جب وہ بات اصل میں ظہور پذیر ہوتی

ہے تو آپ کی ساری حقیقت پسندی دھری رہ جاتی ہے۔

"وہ کبھی بھی اس سے شادی نہیں کرے گا۔ شادی کے لیے تو کوئی بھولی بھالی معصوم سی لڑکی منتخب کی جائے گی۔"

اسے اپنے کہے الفاظ یاد آئے اور شاید اس وقت معصوم لڑکی کے طور پر اس کے ذہن میں اپنا ہی چہرہ آیا ہو گا۔ اس سے تمام تر اختلافات کے باوجود اسے شاید لاشعوری طور پر یقین تھا کہ ایک دن وہ اسے گھر واپس چلنے کے لیے کہے گا اور وہ اس کے پیچھے چل دے گی۔ آج سے پہلے اپنی یہ تمام کیفیات خود اس سے مخفی تھیں۔ اس کا تو خیال تھا کہ وہ حسن عباس سے شدید نفرت کرتی ہے۔ مگر آج پتا چلا تھا کہ نفرت تو شاید ایک دکھاوا تھا۔ وہ تو درحقیقت اپنے بلائے جانے کی منتظر تھی۔ اپنے ہار جانے کا' خود سے ہی شکست کھا جانے کا ماتم کرتی وہ نیچے چلی آئی۔

فریال اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ "کیا ہوا مل گئی تمہاری دوست؟"

اس کے سوال پر اس نے گردن ہلا دی۔ پھر پتا نہیں سارے راستے فریال کیا کیا کہتی رہی اور وہ کیا جواب دیتی رہی' اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"سو زندگی تم پر ہر رخ سے مہربان ہے۔ تم مٹی میں ہاتھ ڈالتے ہو' وہ سونا بن جاتی ہے۔ تم نے زندگی میں وہ سب کچھ حاصل کر لیا جس کا تم نے اور تمہارے ماں باپ نے خواب دیکھا تھا۔ دولت' عزت' رتبہ' معاشرے میں باوقار مقام اور ایک خوب صورت شریک سفر' تم نے سب ہی کچھ پا لیا۔ ٹھیک کہا تھا تم نے' تمہاری زندگی کی ترجیحات میں میرا کوئی ذکر نہیں' اپنا خوش فہمیوں پر ہنسنے کو دل چاہ رہا ہے' کتنے آرام سے میں یہ سپاٹ اور بے رنگ زندگی ایک انتظار میں بیٹھی گزار رہی تھی۔ بظاہر اپنی دوستوں کو اور خود کو بھی جتا کر اندر ہی اندر نہایت پر امید تھی اور بہت سی لڑکیوں کی طرح ہمیں اپنے ماں باپ سے خوش قسمتی یا بد قسمتی بھی وراثت میں ملتی ہے۔ کچھ بچے اچھی شکل صورت' کچھ ذہانت اور کچھ دولت جائیداد وراثت میں پاتے ہیں۔ میں نے وراثت میں اپنی ماں کی بد نصیبی لی۔ میری ماں کی سیاہ بختی میرے جہیز میں شامل ہو گئی۔ لیکن میری ماں تو شاید مجھ سے پھر بھی بہتر تھی اس کے مرنے پر کم از کم دو چار افراد نے تو آنسو بہائے تھے۔ آج اگر میں مر جاؤں تو میری موت پر تو شاید کوئی ایک آنکھ بھی نہ برسے۔ میری زندگی شاید اس جملے کی عملی تفسیر ہے۔

"وہ پیدا ہوئی' اس نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے اور وہ مر گئی۔"

جویریہ چلی گئی۔ عائشہ اور فریال بھی تعلیم مکمل کر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گی۔ عظمیٰ بھی اپنے بھائی کی تعلیم مکمل ہونے پر یہاں سے چلی جائے گی اور میں ساری زندگی یہیں گزار دوں گی۔ مجھے لینے کبھی کوئی نہیں آئے گا۔ ایک لاوارث اور بے نام و نشان لڑکی کو لینے کوئی آئے بھی کیوں۔ سال گزرتے رہیں گے یہاں لڑکیاں آتی اور جاتی رہیں گی مگر ایک بے حد معمولی اور عام سی لڑکی تمام عمر یہیں رہے گی۔ اس کی زندگی میں کبھی کوئی خوشی نہیں آئے گی۔ وہ روز صبح اٹھ کر اپنے لیے رزق حاصل کرنے نکلے گی تو پیچھے کوئی اس کے لیے دعائیں کرنے والا نہیں ہو گا۔ سارا دن محنت مزدوری کر کے وہ شام کو تھکی ہاری آئے گی تو کوئی مسکراتے لبوں سے ساتھ اس کا منتظر نہیں ہو گا۔ اس کی زندگی کا ہر دن ایک سا ہو گا۔ زندگی اس پر کبھی مہربان نہ ہو گی۔ اس کی زندگی میں کوئی چھاؤں نہیں ہو گی اور ایک دن زندگی سے لڑتے لڑتے یونہی مر جائے گی۔ اماں کی رانی جس کے لیے انہیں یقین تھا کہ سپنوں کی نگری سے کوئی راج کمار آ کر اسے اپنے ساتھ اونچے اونچے محلات میں لے جائے گا۔ وہی رانی جب کفن اوڑھے گی تو کوئی ایک شخص بھی اس کے لیے نہیں روئے گا۔"

♥ ♡ ♡ ♥

تین دن بخار میں پھنک کر وہ خود ہی ٹھیک ہو گئی۔

اپنی ڈھیٹ ہڈی پر اسے خود ہی ہنسی آئی۔ فریال، عائشہ اور عظمیٰ نے اس کا بہت خیال رکھا تھا مگر وہ اب ان باتوں سے بہلنے والی نہ تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ باتیں کرنے میں بھی وہ پہلے جیسی گرم جوشی نہیں رہی تھی۔ وہ لوگ اسے اس کی طبیعت کی خرابی سمجھ کر نظر انداز کر گئی تھیں۔

ہر اتوار اسے پیغام ملتا، "آپ کے کزن آئے ہیں۔" وہ کبھی کہتی۔

"کہہ دو سو رہی ہیں" کبھی "کہہ دو کہیں گئی ہوئی ہیں یا نہا رہی ہیں۔"

اسی طرح کرتے ڈیڑھ مہینہ ہو گیا تھا۔

اس روز اتوار نہیں تھی جب اسے پیغام ملا کہ مسز کاظمی آپ کو اپنے دفتر میں بلا رہی ہیں۔ وہ ان کے بلاوے کی نوعیت سوچتی نیچے اتر گئی۔ عموماً مسز کاظمی کسی لڑکی کو ڈانٹنے یا تنبیہہ کرنے کے لیے اپنے آفس بلاتی تھیں اور وہ ان کی بڑی پسندیدہ تھی۔ اس کی تو وہ دوسری لڑکیوں کو مثال دیا کرتی تھیں کہ لڑکیوں کو ایسا ہونا چاہیے۔ اپنے آپ کو چھپا کر باہر نکلو، اپنی نمائش مت کرو۔ کسی وجہ سے نوکری کرنی بھی پڑ رہی ہے تو مردوں کو دعوتِ نظارہ تو مت دو۔ سو وہ اسے ڈانٹنے کے لیے تو بلا نہیں سکتی تھیں۔

ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اسے آتا دیکھ کر بولیں "آؤ بیٹا! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" اس کی نظریں مسز کاظمی کی میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے اس شخص پر جمی تھیں جسے وہ اب زندگی میں دوبارہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس پر نظر ڈالے بغیر مسز کاظمی کی طرف متوجہ رہا۔ اسے وہیں جمے دیکھ کر وہ بولیں۔

"رک کیوں گئیں۔ آؤ بیٹھو، تمہارے لیے تو خیر یہ بہت خوشی کی بات ہوگی۔ لیکن ہم لوگ تمہیں بہت مس کریں گے۔"

وہ ان کی بات کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ اب حسن سے مخاطب تھیں۔

"بہت ہی پیاری عادات ہیں اس بچی کی، جس گھر جائے گی اجالا کر دے گی۔ ماؤں کی اچھی تربیت یہیں ظاہر ہوتی ہے، ایسی نیک اولاد تو ماں باپ کے لیے سرمایۂ افتخار ہوتی ہے۔"

وہ اپنی اس بے موقع توصیف کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ حسن نے اس پر ایک نظر ڈال کر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ اسی وقت ان کے گھر سے بلاوا آ گیا تو وہ ان دونوں سے معذرت کرتی اٹھ کر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ اسے اٹھتا دیکھ کر وہ بولا۔

"بیٹھ جاؤ۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔"

اس کی بات نظر انداز کر کے وہ آگے بڑھی تو وہ غصے سے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

"ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔" وہ اس کے آگے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا تو اسے رکنا پڑا۔

"چلو، میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" اس نے بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"گھر اور کہاں، میں تمہیں گھر لے جانے آیا ہوں۔ کلفٹن میں چار کمروں کا اپارٹمنٹ لیا ہے میں نے۔ تو کرائے کا، اللہ نے چاہا تو اپنا ذاتی مکان بھی خرید لیں گے۔ اتنے دنوں سے اسی کی تگ و دو میں مصروف تھا۔ وہاں کا انٹیریر تمہیں بہت پسند آئے گا۔"

وہ اس کا طنز نظر انداز کر کے بڑے خلوص سے بولا۔

"مجھے بڑے افسوس کے ساتھ آپ کو بتانا پڑ رہا ہے کہ آپ کی ان باتوں پر مجھے ہنسی بھی نہیں آ رہی۔ ویسے اگر یہ مذاق ہے تو نہایت فضول ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بڑی نفرت سے بولی۔

"دیکھو لڑائی جھگڑے کے لیے مسز کاظمی کا آفس ہرگز بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لیے تمام جھگڑا گھر پہنچ کر کرنا۔" وہ سکون سے بولا۔

"میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ جلدی سے خاص خاص سامان لے آؤ۔ باقی چیزیں بعد میں آ جائیں گی۔"

اسی قسم کے فقرے اس نے بہت عرصہ پہلے بھی سنے تھے مگر تب میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

"آپ نے مجھے سمجھا ہوا کیا ہے؟ آپ کہیں گے، میرے گھر سے نکل جاؤ، میں نکل جاؤں گی۔ آپ کہیں گے، واپس چلو میں چلی جاؤں گی۔ مسٹر حسن عباسی! میں کوئی کٹھ پتلی نہیں ایک جیتی جاگتی انسان ہوں اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ اگر میری اب تک کی زندگی کے فیصلے دوسرے لوگ کرتے رہے ہیں تو اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ یہ میری زندگی ہے، اسے میں اپنی مرضی سے گزاروں گی۔ اپنی زندگی کا ہر فیصلہ میں خود کروں گی۔"

وہ بڑے تنفر سے بولی تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے بولا "تمہیں مجھ سے جو شکایتیں ہیں، وہ سب گھر پہنچ کر کر لینا۔ یہاں یہ بات کرنا درست نہیں ہے۔"

"کون سے گھر کی بات کر رہے ہیں آپ؟ وہ جس میں آپ اور آپ کی مغرور حسینہ رہتے ہیں اور جس میں اماں کے سر کا صدقہ یا کسی وعدے کا ایفا کرنے کے لیے مجھے لے جایا جا رہا ہے۔ سوری سر! مجھے کسی پرائے گھر میں تیسرے درجے کا شہری بن کر رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر غصے سے چیخی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔

اسے چپ کھڑا دیکھ کر وہ مزید بولی "وہ گھر جس میں میں نے اپنی زندگی کے بہت سے سال گزارے۔ میری اماں مجھے اپنی جان سے بھی پیاری ہیں اور اب جس گھر کا ذکر آپ کر رہے ہیں وہ خالصتاً آپ کا ہے۔ وہاں جانے سے بہتر میں مرجانا سمجھتی ہوں۔"

وہ چپ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا جو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی نفرت کا اظہار کر رہی تھی۔

"اور آپ برادرِ مہربانی میرے پیچھے آنا چھوڑ دیجیے، روزِ قیامت اگر اماں نے آپ سے اپنے وعدے کے بارے میں باز پرس کی تو میں آپ کی طرف سے گواہی دے دوں گی کہ آپ نے اپنا وعدہ پوری دیانت داری سے نبھایا ہے اور جب میں خود ہی آپ سے کہہ رہی ہوں تو کسی وعدے کی پاس داری کی کوئی ضرورت باقی نہیں بچی۔ میں عرصہ ہوا اس بات پر سمجھوتا کر چکی ہوں کہ میں دنیا میں اکیلی ہوں اور اب مجھے اس بات پر کوئی غم بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا آپ اطمینان سے اپنی زندگی گزاریے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ دروازے کی طرف بڑھی تو حسن نے اسے روکا نہیں۔

کمرے میں آ کر وہ کتنی دیر تک اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اپنی من پسند ہستی سے شادی کر لی۔ خوب صورت گھر اور حسین شریکِ سفر، ایسے میں اپنی خوشیوں کی خیرات سمجھ کر ایک حقیر سی لڑکی کو اپنے گھر میں جگہ دینے کے لیے راضی ہو گئے۔ وہ اب کبھی بھی رونا نہیں چاہتی تھی، اس لیے اپنی آنکھوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس بات کو بمشکل پندرہ دن گزرے ہوں گے کہ ایک بہت ہی انہونی ہو گئی۔ وہ حسن کو انکار کر کے دوبارہ بڑے سکون سے ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔ پتا نہیں حسن نے مسز کاظمی سے کیا کہا تھا کہ انہوں نے اس سے یہاں سے جانے کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اپنی دوستوں سے اس بات کا اس نے سرے سے ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ فریال وغیرہ البتہ اس بات پر حیران تھیں کہ حسن اوّار کو آیا کیوں نہیں۔ ان کے سوال جواب سے تنگ آ کر اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ آج کل پاکستان میں نہیں ہے۔

حارث جنید جو عبید صاحب کے پاس اپنے کسی کام سے آیا تھا، فاطمہ نے اسے بڑے سرسری انداز میں دیکھا تھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ آفس بنا ہوا کچھ اس نوعیت کا تھا کہ عبید صاحب کے کمرے میں جانے کے لیے لازمی اس جگہ سے گزرنا پڑتا تھا جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھی چھ میزوں پر وہ اور دیگر پانچ افراد کام کرتے تھے۔ صبح سے

شام تک وہاں بے شمار افراد آتے جاتے تھے۔ ایسے میں کسی شخص کو خاص طور پر توجہ سے دیکھنا یا یاد رکھنا بڑا ناممکن سا کام تھا۔

مگر جو بات انہونی تھی' وہ حارث جنید کی اگلے روز دوبارہ آمد تھی۔ آج وہ عبید صاحب کے آفس میں جانے کے بجائے اس کی ٹیبل کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ بڑے مہذب انداز میں بیٹھنے کی اجازت طلب کی گئی تو اس نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔ وہ ایک پینتالیس' چھیالیس سال کا خوبرو مرد تھا۔ اپنی ڈریسنگ اور بے حد پُراعتماد انداز سے وہ کوئی بہت ویل آف شخص معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ایسے کسی شخص کا خاص طور پر اپنی طرف متوجہ ہونا سمجھ نہ پائی۔ کچھ دیر وہ اس سے رسمی سی باتیں کرتا رہا۔ ان کا اپنا گروپ آف کمپنیز تھا۔ وہ چاروں بھائی مل کر کاروبار سنبھالتے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ اسے اپنے بارے میں بتاتا رہا اور پھر بغیر اس سے اس کے بارے میں کچھ پوچھے وہاں سے چلا گیا۔ وہ اس کے اپنی جانب متوجہ ہونے اور پھر آکر بات کرنے کی وجہ بالکل بھی نہیں سمجھ پائی تھی۔ کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد بھی جب کوئی سرا ہاتھ نہ لگا تو سر جھٹک کر وہ بے فکر ہو گئی۔

دو روز بعد اس نے حارث کی فون کال اپنے آفس ہی میں ریسیو کی۔ وہ اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے فاطمہ کے اندر چھپے ٹیلنٹ کو پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا تھا اور اتنی اعلا صلاحیتوں کی مالک لڑکی اتنی معمولی ملازمت کرتی کچھ جچتی نہیں۔ اسے تو کسی عالی شان آفس میں ایگزیکٹو پوسٹ پر کام کرنا چاہیے۔ اتنے عرصے سے زندگی کی دھوپ چھاؤں سہ رہی تھی۔ روزانہ بے شمار مردوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ مردوں کی نظریں بہت اچھی طرح پہچان لیتی تھی۔ پہلے ہی روز اس نے یہ بات تو محسوس کر لی تھی کہ حارث جنید اسے کس نظر سے دیکھ رہا ہے مگر وہ اسے ایک شوقین مزاج مرد کی نظریں سمجھ کر نظرانداز کر گئی تھی۔ مگر اب جو جاب کی آفر ہوئی جو کہ اسے پتا تھا کہ اس کی کس صلاحیت کی وجہ سے اسے مل رہی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے دو ٹوک انداز میں منع کرنے کے بجائے اس نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔

رات بھر سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے اس موقع کو گنوانا نہیں چاہیے۔ کیا ساری اقدار' اخلاقیات اور شرافت کے تمام معیار صرف اسی کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اس بار "کسی" کی ضد میں وہ کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔ بہتر معیارِ زندگی اختیار کرنا اس کا بھی حق ہے اور جب خوش قسمتی خود چل کر دروازے تک آگئی تو محض کسی دقیانوسی مشرقی سوچ کے تحت اسے لوٹا دینا نہایت احمقانہ اقدام ہو گا۔ وہ کسی بھی وجہ سے جاب آفر کر رہا ہے' اس کا تو فائدہ ہی ہے۔ وہ کسی کو بتا دے گی کہ ترقی اور کامیابی صرف اسی کا حق نہیں۔ وہ بھی اسے حاصل کر سکتی تھی۔ اس نے کسی سے بھی کوئی مشورہ کیے بغیر صبح ہی حارث کو فون کر کے اپنی رضامندی دے دی۔ وہ شاید توقع بھی کسی ایسے ہی جواب کی کر رہا تھا۔ اس لیے زیادہ حیران بھی نہیں ہوا۔

وہ ایک ہی جست میں بہت اونچائی پر پہنچ گئی تھی۔ بائیس ہزار تنخواہ' پک اینڈ ڈراپ کے لیے بہترین گاڑی اور ڈرائیور اور اس کے علاوہ بھی کئی مراعات تھیں۔ اب اسے دیگنوں کے دھکے نہیں کھانے پڑیں گے۔ وہ بھی قیمتی کپڑے پہن سکے گی — ضروری نہیں کہ اگر وہ غریب پیدا کی گئی ہے تو غریب ہی مر بھی جائے۔ عبید صاحب کو استعفیٰ دیا تو وہ اس کے یوں ایک دم ملازمت چھوڑ دینے پر حیران ہوئے۔ اس نے انہیں بتا دیا کہ اسے کہیں اور بہتر ملازمت مل گئی ہے' اس لیے وہ وہاں جوائن کر رہی ہے۔ کہاں ملی ہے یہ بتانے کی اس نے ضرورت محسوس نہ کی' حارث کا آفس جوائن کرنے سے ایک روز پہلے وہ فرہاں کے ساتھ ڈپلیکیس چلی آئی۔ فرہاں ہر مہینے بڑے پابندی سے پارلر یا تراپر جایا کرتی تھی۔ اسے اپ ٹو ڈیٹ رہنے کا شوق تھا۔ اس کے ساتھ چلنے کی بات پر وہ بہت خوش ہوئی اور بولی۔

"بہت اچھا کر رہی ہو۔ میں تو خود کہتی ہوں کہ ہر انسان کو بہتر سے بہتر نظر آنے کا حق ہے۔ یہ جو لڑکیاں بڑے اسٹائل سے رہتی ہیں اور بہت حسین نظر آتی ہیں ان میں سے خداداد خوب صورتی تو شاید ایک آدھ ہی کے پاس ہو۔ سب اپنے آپ پر توجہ دے کر خوب صورت نظر آتے ہیں۔ تمہیں بھی اگر اپنی پرسنالٹی کو گروم کرنے کا خیال آیا ہے تو یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔"

بالوں کی لیئر کٹنگ کروا کر ان میں اسٹریکنگ کروائی۔ آئی برو' فیشل اور مینی کیور پیڈی کیور وغیرہ کروا کر جب وہ ڈپلیکس سے باہر نکلی تو ایک بدلی ہوئی فاطمہ عارف تھی۔ اس کے تصور میں کسی کا ہراساں کرنا لرزا رہا تھا جو ہر وقت اسے چیلنج کرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ہاسٹل آکر اس نے آئینے کے آگے کھڑے ہو کر کتنی ہی دیر تک اپنا جائزہ لیا۔ ذرا سی توجہ دینے کی دیر تھی۔ وہ اپنے ہی آپ کو بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر اپنا موازنہ کسی کے ساتھ کر رہی تھی۔ کوئی بڑی ادا سے بالوں کو شانوں پر جھٹک کر اسے چیلنج کر رہا تھا۔ اسے لگا۔ آج وہ اس مقابلے کی دعوت دینے والی لڑکی سے زیادہ حسین لگ رہی ہے۔

بہترین تراش خراش کا دیدہ زیب لباس پہن کر وہ پہلے روز اپنے آفس گئی تو حارث نے بڑی خوش دلی سے اسے ویلکم کیا۔ اس کی تبدیلی کو بہت سراہا۔ اس کی تعریف اور خود پر مرکوز اس کی نگاہیں اسے اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ مگر وہ اپنی اس کیفیت پر خود ہی کو ڈانٹ رہی تھی۔

"رہی میں وہی کنوار کی کنوار اور پینڈو' میرا خیال ہے مجھے اب اس شہر کے طور طریقے سیکھ ہی لینے چاہئیں۔ یہ نام نہاد شرافت صرف اور صرف ایک ڈھکوسلہ ہے۔ درحقیقت ایسی ہی لڑکیوں کی حیثیت ہے جو خود کو سجا کر سنوار کر رکھیں۔ ہونہہ' سادگی' شرافت' اقدار سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں جو صرف کتابوں ہی میں اچھی لگتی ہیں۔"

اپنے آپ کو ہر طرح تبدیل کرنے کے باوجود بھی وہ اپنے دوپٹے کو رسہ کی طرح گردن میں نہیں ڈال پائی تھی۔ بے حد فٹنگ کے خود کو ظاہر کرتے کپڑے نہیں پہن پائی تھی۔ گہرے گلے اور ہاف سلیوز بھی نہیں پہن پائی تھی۔ شاید اماں کی تربیت اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ لہٰذا اپنی تمام تر تبدیلی کے باوجود اس کا اماں جوڑا دوپٹہ جس نے اس کے وجود کو چھپایا ہوا تھا۔ اپنی جگہ برقرار تھا۔ اپنے خوب صورت سے ایئر کنڈیشنڈ آفس میں بیٹھ کر اس نے خود کو بہت معتبر محسوس کیا۔ اس کے آفس جوائن کرنے کی خوشی میں حارث نے اسے اپنے آفس میں لنچ کروایا اور کام کی نوعیت کے بارے میں بتایا۔

دوسرے دن وہ ابھی آکر اپنے آفس میں بیٹھی ہی تھی کہ کوئی بڑی بدتمیزی سے دروازے کو دھماکے سے کھولتا اندر چلا آیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو غصے سے لال پیلا چہرہ لیے حسن اور اس کے پیچھے اس کا پیون کھڑا تھا۔

"میڈم! میرے روکنے کے باوجود یہ صاب زبردستی اندر گھس آئے ہیں۔" وہ اپنی متوقع ڈانٹ پھٹکار سے ڈر کر وضاحت کرنے لگا۔ اس کے کچھ جواب دینے سے پہلے حسن اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ایک نظر اس پر ڈال کر اس نے سکون سے پیون سے کہا۔

"ٹھیک ہے' آپ جائیں۔" وہ بے چارہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

"فرمائیے' کیسے آنا ہوا؟" اس نے اطمینان سے پوچھا۔ نگاہوں میں تمسخر اور مقابل کے لیے چیلنج تھا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر اسے گھورتا رہا۔ جبکہ وہ اس کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر آرام سے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔

"بہت خود مختار ہو گئی ہو تم۔ تمہارے خیال سے میں نے تمہیں اتنی آزادی دے دی ہے کہ تم جو مرضی کرتی پھرو اور میں خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہوں۔" وہ غصے سے چیخ اٹھا تھا۔ "آج تک اگر تمہاری کسی بات پر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تو

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں ایک روشن خیال اور لبرل آدمی ہوں۔ تم نے مجھ سے پوچھے بغیر جاب کرلی۔ میں چپ رہا کہ چلو ایک تجربہ ہی سہی اور پھر وہاں کا ماحول بھی اچھا تھا۔ لیکن اپنی تمام تر لبرل سوچ کے باوجود میں اتنا آزاد خیال بھی نہیں کہ تم اپنی من مانی کرو اور میں تمہیں روک نہ سکوں۔ فاطمہ صاحبہ! مجھے اپنی مشرقی روایات اور اپنا اس معاملے میں کنزرویٹو ہونا بڑا عزیز ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر غرایا تھا۔

"آپ کا اتنا غصہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں نے آپ کو اپنے ذاتی معاملات میں بولنے کی اجازت تو ہرگز بھی نہیں دی۔ میرے ہی آفس میں بیٹھ کر مجھے دھمکیاں دینے والے آپ ہیں کون؟ صرف ایک کزن۔ معاف کیجئے گا میں نے آپ کو ایسا کوئی حق نہیں دیا کہ آپ میری ذاتیات میں مداخلت کریں۔" اس کے غصے کا جواب بڑے سکون سے دے کر وہ براہ راست اس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

"میں تمہارا سرپرست ہوں اور تمہیں کسی بھی غلط کام سے روکنا میرا فرض ہے۔" اب کے وہ اپنے غصے کو کنٹرول کرکے کچھ دھیمے انداز میں بولا۔

"میں ایک عاقل، بالغ اور باشعور لڑکی ہوں۔ مجھے کسی نگار جیتن کی ضرورت نہیں۔" وہ انگلی اٹھا کر ٹوکنے والے انداز میں بولی۔

"ویسے آپ کا مسئلہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو کس بات سے تکلیف ہو رہی ہے۔ ایک ایسی لڑکی جسے ساری زندگی آپ اپنا دست نگر دیکھنا چاہتے تھے، شاید اپنی انا کی تسکین کے لیے، اس نے بڑے اطمینان سے آپ کے حصار سے نکل کر اپنی زندگی خود جینی شروع کر دی ہے اور یہ بات آپ کو تکلیف دے رہی ہے کہ کل تک جو میری محتاج تھی۔ آج میرے مقابل کیسے آ گئی۔" وہ استہزائیہ لب و لہجہ اختیار کر گئی تھی۔

"فاطمہ! تم پاگل ہو گئی ہو۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے، یہ نوکری تمہیں تمہاری کسی صلاحیت کی وجہ سے ملی ہے۔ یہاں بڑے بڑے ڈگری ہولڈرز، تجربے کے سرٹیفکیٹ ساتھ لیے نوکری کے لیے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور معمولی سی نوکری بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ تمہارا کیا خیال ہے، تم میں سرخاب کے پر لگے ہیں کہ کسی غیر معمولی کوالیفکیشن، تجربے اور سفارش کے بغیر تمہیں اتنی اچھی جاب مل گئی ہے۔ یہ مرد کس کس طرح عورتوں کو ایکسپلائٹ کرتے ہیں، تمہیں کچھ نہیں پتا، تم جیسی بیوقوف لڑکیاں تو ویسے بھی آسان ترین شکار ثابت ہوتی ہیں۔" وہ اب اسے سمجھا رہا تھا۔ "تم تو شکل سے ہی اتنی معصوم اور سیدھی سادی نظر آتی ہو اور مردوں کو ایسی لڑکیاں بہت اٹریکٹ کرتی ہیں۔ ساری دنیا کی عورتوں کا تو میں نے ٹھیکہ نہیں اٹھالیا۔ لیکن اپنے گھر کی عزت کی حفاظت کرنا مجھے خوب آتا ہے۔" وہ کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"میں یہاں کوئی سین کریئیٹ نہیں کرنا چاہتا، اس لیے تمہیں پہلی اور آخری وارننگ دے کر جا رہا ہوں کہ آج ہی یہاں سے ریزائن کر دو۔ آج کے بعد تم مجھے کبھی اس دفتر میں نظر آئیں تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا اور اسے صرف دھمکی مت سمجھنا، میں جو کہتا ہوں، وہ کرتا بھی ہوں۔ امید ہے میری بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی۔"

وہیں کھڑے کھڑے اسے نرم الفاظ میں وارننگ دی اور پھر دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کافی دیر تک خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن شدید ترین غصے کی اس لہر کو وہ روک نہیں پا رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

مختلف لوگوں کی مختلف ہابیز ہوتی ہیں۔ حارث جنید کی ہابی خوب صورت لڑکیاں تھیں۔ شادی شدہ دو بچوں کا باپ ہونے کے باوجود اس میں لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ اس کی بے تحاشا دولت، اسٹیٹس اور مردانہ وجاہت ایسے ہتھیار تھے کہ لڑکیاں خود بخود ہی اس کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں یہ اور بات کہ کسی بھی لڑکی کے ساتھ اس کا تعلق چند ماہ سے زیادہ نہ رہتا تھا۔ زیادہ تر لڑکیاں اسی کی طرح اپر کلاس سے تعلق رکھتی تھیں اور جان بوجھ کر اس کے نزدیک آتی تھیں۔ عورت کی حیثیت اس کے نزدیک ایک کھلونے سے زیادہ نہ تھی۔

عبید دارنی کی ٹریول ایجنسی میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی اس لڑکی نے اسے پہلی ہی نظر میں چونکا دیا تھا۔ وہ اب تک کتنی ہی لڑکیوں سے دوستیاں کر چکا تھا اور یہ دوستیاں اخلاقیات کی تمام حدود بھی پار کر چکی تھیں مگر اس لڑکی میں کچھ ایسا تھا کہ وہ مبہوت رہ گیا۔ وہ کوئی آسمان کی حور پری نہیں تھی مگر پھر بھی کوئی بات تھی جو غیر معمولی تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا لگا جیسے کوئی معصوم سی ہرنی کسی جنگل سے بھٹکتی اتفاقیہ اس شہر میں آ گئی ہے۔ اس کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی کہ وہ اسے کتنی ہی دیر دیکھتا رہا تھا۔ اس نے اپنی اب تک کی زندگی میں حسن ہر رنگ میں دیکھا اور برتا تھا مگر ایسی معصومیت اور پاکیزگی اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ بے اختیار اسے تسخیر کرنے کی خواہش اس کے دل میں ابھری تھی۔ اپنی اس خواہش کے پیش نظر وہ اس کے پاس پہنچ گیا اور تھوڑی ہی دیر بات کر کے اندازہ ہو گیا کہ اسے تسخیر کرنا تھوڑا مشکل سہی پر نا ممکن نہیں۔

اس لڑکی کا مسئلہ معاشرے میں باعزت مقام اور اچھی نوکری حاصل کرنا تھا، سو اسے اپنے ہاں کام کرنے کی آفر کر دی۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ بن گئی تھی۔ وہ اس کی اب تک کی تمام دوستوں سے مختلف تھی، سو اس نے بھی اپنا رویہ بڑا محتاط رکھا تھا۔ وہ جلد بازی میں کام بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی صرف اپنے اوپر پڑنے والی نظروں کو ناپسند کرتی تھی مگر بوجوہ خاموش رہتی تھی۔ سو وہ فی الحال اس سے دور اور صرف کام کی بات کرتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ شکار ذرا مشکل ہے لیکن اسے مشکل کام کرنے میں مزہ آتا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

حسن کی دھمکی کو نظر انداز کر کے وہ اگلے روز بھی آفس آ گئی اور بڑے مطمئن انداز میں اپنا کام کرنے لگی۔ لنچ ٹائم میں حارث اس کے کمرے میں آ گیا اور بولا۔

"آپ لنچ کہاں کریں گی؟" اس نے فائل پر سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور بولی۔

"میں لنچ لے کر آتی ہوں۔"

"ساتھ لایا ہوا لنچ کسی اور کو کھلا دیجئے گا۔ آج آپ میرے ساتھ لنچ کریں۔" وہ اس کی میز کے سامنے کھڑا مسکرا کر بولا۔

بے اختیار منع کرنے سے اس نے اپنے آپ کو روکا۔ اسے الجھن میں مبتلا دیکھ کر وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"یقین کریں، میں بہت اچھا میزبان ثابت ہوں گا۔"

اپنے آپ سے جنگ کرتی وہ آخر کار کھڑی ہو گئی تو اس کے اندر کوئی اس سے ناراض ہو گیا۔ دل سے آواز آ رہی تھی کہ یہ ٹھیک نہیں، وہ اس تنبیہ کو نظر انداز کرتی اس کے ساتھ باہر نکل آئی جبکہ حارث جنید اپنی اس کامیابی پر سرشار سا تھا۔

پارکنگ ایریا میں آ کر وہ اپنی گاڑی کا لاک کھولنے لگا اور وہ دوسری طرف کے دروازے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت ایک گاڑی انتہائی تیز رفتاری سے فاطمہ کے پاس آ کر رکی۔ اگر وہ فوراً ہی دو قدم پیچھے نہ ہٹ گئی ہوتی تو گاڑی کے ٹائر اس کے پیروں کو کچلتے ہوئے بریک لگاتے۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر اترتے حسن کو دیکھ کر ایک لمحہ کو تو وہ کانپ گئی۔

ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں وہ اس کے سامنے آ گیا اور آتے ہی ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولا۔

"کہا تھا ناں۔ دوبارہ یہاں نظر آئیں تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔" وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھے وہ اسے دیکھتی رہ گئی جو انتہائی مشتعل نظر آ رہا تھا۔

"مسٹر! آپ کون ہیں اور یہ کیا حرکت ہے؟"

حارث آگے بڑھ کر اسی طرف آگیا۔
"ہٹو تم سامنے سے' یہ ہمارا پرسنل معاملہ ہے۔"
اس نے حارث کو پرے دھکیلا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اپنی گاڑی تک لے آیا۔ وہ جو اب تک شاک کی کیفیت میں تھی' ایک دم بلبلا اٹھی۔
"چھوڑو مجھے۔" وہ اس کی مضبوط گرفت سے خود کو چھڑانے لگی۔
پارکنگ ایریا میں اس وقت لنچ ٹائم کی وجہ سے رش تھا۔ سو اچھا خاصا تماشا لگ گیا تھا۔ تمام لوگ اس سچویشن کو دیکھ کر یہی سمجھ رہے تھے کہ کوئی لڑکی دن دہاڑے اغوا ہو رہی ہے اور بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ اخلاقی اعتبار سے اتنا دیوالیہ ہو گیا ہے کہ روڈ پر کوئی خون میں نہایا جان دے دے یا کوئی لڑکی دن دہاڑے بھرے بازار میں اغوا کرلی جائے' کسی میں اتنی اخلاقی جرات نہیں کہ اسے بچائے سو اس وقت بھی سب تماشائی بنے اس صورتِ حال کو دیکھ رہے تھے۔
اسے گاڑی میں دھکیل کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ یہ سب کچھ صرف دو یا تین سیکنڈز کے اندر اندر ہوا تھا۔ گاڑی کی رفتار انتہائی حدوں کو چھو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب ایکسیڈنٹ ہوا کہ تب۔ اسے اتنے شدید غصے میں اس نے اب تک کی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لاکھ اس کے مقابل ڈٹ کر کھڑی ہونے لگی تھی' اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگی تھی مگر اس وقت اس کے غصے سے وہ بری طرح ڈر رہی تھی۔
گاڑی پارک کر کے اسے اسی طرح گھسیٹتا ہوا سیڑھیوں سے ہی اوپر لے آیا۔ لفٹ سے نکلتے اور کوریڈور میں کھڑے دو چار افراد نے اس منظر کو تعجب سے دیکھا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس کا بازو دبوچے دوسرے سے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور اسی طرح لا کر اسے ایک کمرے میں بستر پر پٹخ دیا۔ وہ اوندھے منہ بیڈ پر گری تھی۔
"دل تو میرا تمہیں قتل کرنے کا چاہ رہا ہے مگر میں ایسا نہیں کر رہا ہوں تو صرف اپنی اماں کی وجہ سے۔" وہ اس کے سر پر کھڑا چیخ رہا تھا۔ "شرم آ رہی ہے مجھے تمہیں اپنی کزن کہتے ہوئے۔ شکر ہے آج اماں نہیں ورنہ تمہاری اتنی گھٹیا حرکتوں پر وہ صدمے سے مر جاتیں۔"
انتہائی غصے کے عالم میں کھڑا دو چار منٹ اسے دیکھتا رہا پھر پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔
دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی۔ وہ لاؤنج میں صوفے پر پڑا اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ گھڑی پر نظر پڑی تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ خود کو پرسکون اور نارمل کرنے کے لیے ٹھنڈے پانی سے نہایا۔ نہانے سے طبیعت خاصی بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ اعصاب پرسکون ہو گئے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

خود بھی دوپہر سے بھوکا تھا اور وہ بھی' اس لیے کھانے کا بندوبست کرنے کا خیال آیا۔ گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر جاتے ایک نظر اس کمرے کے بند دروازے پر ڈالی جہاں اسے لا کر ڈالا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے وہ خود کو دوپہر کے مقابلے میں خاصا بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اس کا پسندیدہ پزا اور بہت ساری آئس کریم لے کر واپس آیا اور جلدی جلدی ٹرے میں پزا پلیٹیں' گلاس اور پیپسی کی لیٹر بوتل رکھ کر اس کے کمرے میں آگیا۔ جس زاویہ سے پڑا اسے چھوڑ کر گیا تھا' وہ ابھی تک اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس کے آنے پر بھی وہ اسی طرح پڑی رہی تھی۔
ٹرے سائڈ میں رکھ کر وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا اور بولا۔
"مجھے اپنی کسی حرکت پر کوئی افسوس نہیں اس لیے تم یہ امید مت رکھنا کہ میں تم سے معذرت کروں گا۔"
اس کی بات کے جواب میں بھی دوسری طرف کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تھی۔
"اٹھو کھانا کھالو۔" اس نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچ کر اٹھا دیا۔ اس طرح کہ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل آمنے سامنے تھے۔ اس کے چہرے

پر پھیلی آنسوؤں کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔ اس کے روئے روئے چہرے پر گہری نظر ڈالتا ہوا بولا۔

"جاؤ جا کر منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔" اس کے دھیمے لب ولہجے سے ظاہر بھی نہیں ہو رہا تھا کہ دوپہر ان کے درمیان کیا ہوا تھا۔

اس کی بات کے جواب میں بھی وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔

"اچھا منہ نہیں دھونا رہیں تو ایسے ہی کھالو۔" اس کے لیے پلیٹ میں نوالہ رکھتے ہوئے بولا۔

پھر پلیٹ اس کے آگے کی تو وہ ہاتھ بڑھائے بغیر ویسے ہی بیٹھی رہی۔

"اب کیا میں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں۔" وہ کچھ بے بسی سے بولا۔ "دیکھو' خالی پیٹ تو تم سے کچھ بولا بھی نہیں جائے گا جبکہ ابھی تمہیں مجھ سے بہت سارا لڑنا بھی ہے۔"

اس کی اس بات پر پہلی مرتبہ سر اٹھا کر اسے دیکھا گیا تھا۔ پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے کر سائڈ میں رکھ دی اور بولی "مجھے کچھ نہیں کھانا۔"

"شرافت سے پلیٹ اٹھا کر کھانا شروع کرو۔ ورنہ تمہیں معلوم ہے مجھے گھی ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنا بھی آتا ہے اور تمہارے بارے میں میرا تازہ ترین خیال یہ ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ تم سے کچھ بھی کہنا سننا عبث ہے۔ تم صرف ڈنڈے کی زبان سمجھتی ہو اور اب میں وہی زبان استعمال کروں گا۔"

اس کے دھمکانے پر وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی "مجھے واپس جانا ہے۔"

"کہاں واپس جانا ہے؟" وہ اپنے لیے پراٹھا نکالتے ہوئے بولا۔

"میں اکیلی بھی جا سکتی ہوں۔" وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"بہت شوق ہے تمہیں ملکہ عالیہ بننے کا۔ لوگ ہر وقت تمہاری پوجا کرتے رہیں۔ تم غرور سے سر تانے اپنی پرستش ہوتی دیکھتی رہو۔ اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے کے بجائے اکڑ رہی ہو۔ یہ میں ہی ہوں جو تمہاری اتنی من مانیاں اور بے ہودگیاں برداشت کر رہا ہوں کوئی اور ہوتا تو تمہارا دماغ دو سیکنڈ میں درست کر دیتا۔" وہ دوبارہ غصے میں آ گیا تھا۔

"کب کہا ہے میں نے کہ مجھے برداشت کریں۔ آپ بہت اچھے ہیں اور میں بہت خراب ہوں۔ اتنے اچھے لوگوں کو تو ویسے بھی برے لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔" بھرائی ہوئی آواز میں بمشکل اپنی بات مکمل کر کے وہ آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اب یہ پھر سے خود ترسی کا دورہ پڑا ہے۔ خود پر ترس کھا کھا کر تم نے اپنے آپ کو کسی قابل نہیں چھوڑا۔ سناؤ پھر وہی دکھ بھری داستان کہ میں اکیلی ہوں۔ میرا کوئی نہیں وغیرہ۔ تم اپنے آپ پر جب اس طرح رحم کھاتی ہو تو مجھے تمہاری اس سوچ پر رحم آتا ہے۔" وہ اس کی برسنے کے لیے بے تاب آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ تھوڑی دیر بعد خود ہی بولا۔

"رونے کا دل چاہ رہا ہے تو رو لو۔ ویسے رونا تمام مسائل کا حل نہیں ہوتا۔"

اس کے کہنے کی دیر تھی۔ آنسو بڑی شدت سے بہنے شروع ہو گئے تھے۔ حسن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس بیڈ پر بٹھایا اور بولا۔

"ذرا سوچو' تم کیا کرنے جا رہی تھیں؟ کیا اماں نے تمہیں اسی بات کی تربیت دی تھی؟ میرا فرض بنتا تھا کہ تمہیں کسی غلط راستے پر چلنے سے روکوں۔"

"میں کچھ غلط نہیں کر رہی تھی۔ دنیا کی کتنی ہی لڑکیاں جاب کرتی ہیں۔ میں نے کیا غلط کیا؟" وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

"غلط آدمی کے پاس گئیں ناں۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی۔ تم اتنی بیوقوف اور سیدھی ہو' تمہیں اپنے نفع نقصان کا کچھ پتا نہیں۔ وہ اول درجے کا فلرٹ اور کرپٹ آدمی ہے۔ جب صحیح جگہ جاب کر رہی تھیں۔ میں کچھ نہیں بولا تھا۔" وہ نرم لہجے میں

بولا۔ پھر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

"تمہاری سادگی اور معصومیت ہی تمہارا حسن ہے۔ تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے کہ مادر پدر آزاد جدیدیت کی حامی لڑکیوں کے طور طریقے اپناؤ۔ تم جیسی ہو ویسے ہی بہت اچھی ہو۔"

وہ ایک دم یوں پیچھے ہٹی تھی جیسے کرنٹ لگا ہو۔ اس کا ہاتھ جھٹک کر خود ہی اپنے ہاتھوں سے رگڑ کر آنسو صاف کیے اور بڑے طنزیہ انداز میں بولی۔

"ان ہی جدیدیت کی حامی لڑکیوں کے ساتھ جب شہر کی سڑکیں ناپی جاتی ہیں تو وہ بہت اچھی ہو جاتی ہیں۔ میں کسی سے نہ ملوں' بات نہ کروں کہ اس سے عزت اور غیرت کے مسئلے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خود دن بھر لڑکیوں کو ساتھ لے کر گھومتے رہیں تو وہ جائز ہے۔ اگر یہی دوغلی سوچ ہے جس کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا تو تف ہے اس آزاد خیالی پر۔"

اس کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔ جبکہ وہ ویسے ہی غصے میں بھری بیٹھی تھی۔

"اور میں اتنی سادہ اور معصوم بھی نہیں ہوں جتنا اکثر لوگ مجھے سمجھتے ہیں۔ میں بڑی سی چادر کی بکل مار کر باہر نکلوں۔ مجھے کوئی نہ دیکھے اور خود تمام دن حسینائوں کے جھرمٹ میں گزاریں۔ کتنا دہرا معیار ہے یہ۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"بھئی وہ میری کولیگز ہیں' ان سے میں یہ نہیں کہہ سکتا' چادر اوڑھو یا یہ کرو وہ کرو۔ انہیں ان کے گھر والے روکیں گے۔ میرا کام اپنے گھر کی حفاظت کرنا ہے۔"

پھر اس کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر بولا۔ "مجھے پتا تھا۔ اصل غصہ صرف اسی بات کا ہے۔ باقی باتیں تو ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔"

اس کی بات پر اس نے غصے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ مسکراتے چہرے کے ساتھ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"وہ شفق بھی کہہ رہی تھی کہ تمہاری کزن بڑی بد دماغ اور سڑیل سی ہے۔ تم ایسی لڑکی کو برداشت کیسے کرتے ہو۔"

"اس سے کہیں' میرے غم میں دبلا ہونا چھوڑ دے۔ اس نے خود تو اخلاقیات میں ڈاکٹریٹ کر رکھی ہے وہی کافی ہے۔ میں جیسی بھی ہوں ٹھیک ہوں۔" اس ایک لڑکی سے تو وہ شدید نفرت کرتی تھی سو اس کے ذکر پر آگ بگولہ ہونا لازمی تھا۔

"تمہیں اس بے چاری سے آخر دشمنی کیا ہے؟" وہ زبردستی سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ کوئی جواب دینے کے بجائے چپ ہو کر بیٹھ گئی۔ اس موضوع پر کچھ بھی بول کر خود کو ظاہر کرنا اسے ہرگز منظور نہ تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ ملاحظہ کر رہا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ کھانا شروع کرتا ہوا بولا۔

"مجھ سے اب مزید بھوکا نہیں رہا جا سکتا' لہٰذا میں تو کھا رہا ہوں۔ تم شوق سے ایسے ہی بیٹھی رہو۔ ویسے بھی اماں کی طرح کے چونچلے کرنے مجھے نہیں آتے کہ میری گڑیا' میری رانی کھانا کھا کر میری زندگی پر احسان کرو۔" وہ آرام سے پاؤں پھیلائے کھانا کھانے لگا۔

"درحقیقت سچ بھی یہی ہے کہ اماں کے بے جا لاڈ پیار نے تمہارا دماغ اتنی بری طرح خراب کر دیا ہے کہ اب تمہارے سدھرنے کے کم از کم مجھے تو کوئی آثار نظر نہیں آتے۔"

اس کی بات پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور بولی۔

"مجھے پتا ہے' آپ کو ہمیشہ اسی بات پر مجھ سے خار چڑھی رہی کہ میں آپ کی اور اماں کی محبت کے درمیان حائل ہو گئی' آپ نے مجھے شروع دن سے اپنے گھر میں قبول نہیں کیا تھا' شاید آپ کو لگا تھا کہ میں آپ کی محبت شیئر کرنے آئی ہوں۔"

"یہ بالکل جھوٹا الزام ہے۔ تم اسے کبھی بھی ثابت نہیں کر سکتیں۔" اس نے پلیٹ واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے گویا خود کو تمام سوال جواب کے لیے تیار کیا۔

"مجھے ثابت کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں یہ بات جانتی ہوں۔ آپ نے ہمیشہ مجھ سے نفرت کی ہے۔" وہ ناراض لہجے میں بولی۔

"میں نے تم سے ہمیشہ محبت کی ہے۔ اور تم اس محبت کو کسی اور معنوں میں لینے کی کوشش مت کرنا۔ یہ محبت بالکل ایسی ہی تھی۔ جیسی ایک گھر میں رہنے والے افراد آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ تم جس روز ہمارے گھر آئی تھیں۔ میں نے اور اماں نے تمہیں اسی روز اپنے گھر کا ایک فرد مان لیا تھا' ہم نے تمہیں کبھی پرایا نہیں سمجھا۔ البتہ کھوٹ تو تمہاری نیت میں تھا۔ تم نے اس گھر کو اور ہمیں کبھی سچے دل سے اپنا نہیں سمجھا۔ خود کو ہمیشہ غیر سمجھتی رہیں۔" وہ سست رسان سے بولا۔

"آپ اماں کو بیچ میں مت لائیں۔ مجھے ان کی محبت اور خلوص پر کوئی شک نہیں' مجھے ان کی محبت پر فخر ہے۔"

"اور میری محبت اور خلوص پر شک ہے۔؟" وہ ناراض ہوا۔

"ٹھیک نہیں مجھے یقین ہے کہ آپ کو میں کبھی اچھی لگی ہی نہیں۔ ایک بوجھ اور زبردستی کی ذمہ داری سمجھا ہے آپ نے مجھے۔ ہمیشہ میرا دل دکھایا' میری انسلٹ کی۔"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تو وہ بے اختیار ٹوکنے والے انداز میں بولا۔

"اگر دکیلوں کی طرح جرح کرنے کھڑی ہوئی ہو تو رونے دھونے کے بجائے اپنے اوپر لگنے والے الزامات کا بھی دفاع کرو۔ اگر میں کہوں کہ تم نے ہمیشہ میرا دل دکھایا ہے' مجھ سے نفرت کی ہے اور مجھے اگنور کیا ہے تو تم کیا کہو گی۔"

"میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔" وہ روتی ہوئی بولی۔

"کیا ہے تم نے ایسا' بے شمار مرتبہ تم نے میرا دل دکھایا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ مظلوم بھی خود ہی بن کر بیٹھ گئی ہو۔" وہ اپنی بات میں زور پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"میں خالی خولی دعوے نہیں کرتا۔ اپنی بات کو ثابت بھی کر سکتا ہوں۔ تمہارا خیال ہے تم اکیلی ہو۔ تمہارا کوئی نہیں' نہ ماں باپ نہ بہن بھائی نہ کوئی اور رشتے دار تمہیں کوئی پوچھنے والا' تم سے محبت کرنے والا کوئی نہیں تو یہ سب کچھ تو میرے ساتھ بھی ہے' تمہاری طرح ماں' باپ' بہن' بھائی اور رشتے دار میرا بھی کوئی نہیں ہے۔ پھر تو اصولاً مجھے بھی تمہاری طرح مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹنا چاہیے۔ کیا میرا گناہ یہ ہے کہ میں مرد ہوں' میں تمہاری طرح رو نہیں سکتا لیکن ایک انسان تو ہوں' کیا مجھے اس بات کا غم نہیں ہے۔ میرا ایک محبت بھرا گھر تھا جہاں ہم اپنی ماں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے چھن گیا۔ اگر خود ترسی تمام مسائل کا حل ہوتی تو میں بھی تمہاری طرح خود ترس ہو جاتا۔"

اسے لب کھولتے دیکھ کر ٹوکتے ہوئے بولا "ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔" پھر دو چار سیکنڈ کے وقفے کے بعد وہ گویا ہوا۔ "مجھے یہ بات کہہ لینے دو کہ تم خود ترسی کے مرض میں بری طرح مبتلا ہو۔ اور اس بیماری کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ اماں کے انتقال کے بعد تم تو صرف اس غم میں ہلکان ہو رہی تھیں کہ اماں نہیں رہیں۔ لیکن میرے اوپر دہری ذمہ داری تھی۔ مجھے اپنا دکھ بھول کر تمہارے لیے۔ خود کو کمپوز کرنا تھا' اماں اگر جانے سے پہلے مجھ سے کوئی وعدہ نہ بھی لیتیں تب بھی میں تمہارا خیال رکھتا۔ تمہاری حفاظت اپنی جان سے بھی بڑھ کر کرتا۔ اماں کے بعد میں ایک دم بوکھلا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ ظاہر ہے اماں کے بغیر ہم دونوں ایک ساتھ وہاں نہیں رہ سکتے تھے۔ اماں کے انتقال کے بعد میں مسلسل اسی سوچ میں لگا ہوا تھا کہ کیا کروں۔ سب سے پہلا خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ تمہاری شادی کر دوں۔ میرے دو چار جاننے والے تھے جہاں میں تمہاری شادی کر سکتا تھا۔ اور شاید میں ایسا کر بھی دیتا لیکن پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ ایسا کر کے میں تمہارے ساتھ بہت بڑی زیادتی کروں گا۔ تم تو شاید

بے زبان گائے کی طرح میری بات مان بھی جاتیں لیکن مجھے تم پر بے تحاشا ترس آیا۔ میں اس وقت بھی یہ بات کہتا تھا اور آج بھی کہتا ہوں کہ اماں کا محبت کرنے کا انداز درست نہ تھا۔ ٹھیک ہے' وہ تم سے بے حد پیار کرتی تھیں لیکن محبت یہ نہیں کہتی کہ ہم جس سے پیار کرتے ہیں اسے اپنے سہارے کے بغیر چلنے ہی نہ دیں۔ اماں کی محبت نے تم سے خود اعتمادی چھین لی تھی۔ تم ایک ڈری سہمی سی چڑیا کی طرح تھیں۔ زندگی کے بارے میں تمہارے کوئی نظریات نہیں تھے۔ تمہارے خیال سے زندگی اسی گھر تک محدود تھی۔ تم اپنے کپڑوں' جوتوں سے لے کر پڑھائی کے لیے مضامین اختیار کرنے تک ہر معاملہ میں اماں کی محتاج تھیں۔

جب یہ خیال میرے ذہن میں آیا تو میں نے سوچا کہ ابھی تمہاری شادی نہیں کرنی چاہیے۔ تمہیں زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملنا چاہیے۔ تم ایک بیتی جاگتی' باشعور لڑکی تھیں۔ کیوں آخر تمہارے بارے میں ہر فیصلہ میں یا اماں ہی کرتے۔ تمہیں حق تھا کہ تم اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرو۔ زندگی کو سمجھو' اسے قریب سے دیکھو۔ یہ سوچ کر میں نے تمہیں ہاسٹل بھیجنے کا سوچا' تاکہ تم سٹڈی کر لو۔

یونیورسٹی جاؤ' لوگوں سے ملو اور زندگی کے بارے میں خود سوچو۔ مجھے نہیں پتا کہ ایسا کر کے میں نے کون سا گناہ کیا تھا جو تم مجھ سے ناراض ہو گئیں۔ اور یہ الزام لگایا کہ میں نے تمہیں گھر سے نکالا ہے۔ میں نے تمہیں اکیلا تو نہیں چھوڑا تھا۔ میں ہر لمحہ تمہارے ساتھ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم میں خود اعتمادی پیدا ہو' تم زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکو۔ تاکہ اگر کسی وقت میں نہ رہوں تو بھی تم ہمت نہ ہارو۔ تم خود پر بھروسا کرنا سیکھ جاؤ۔ لیکن تم نے اسے گھر سے نکالنا' اور اپنی انسلٹ سمجھ لیا۔ مجھ سے ناراض ہو گئیں۔ یہاں تک کہ مجھ سے پیسے لینے سے بھی انکار کر دیا۔"

وہ ایک لمحہ کو سانس لینے کو رکا تو وہ بول پڑی۔

"میں ہاسٹل جانے پر ناراض نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے میری انسلٹ کی تھی۔ مجھے اتنا دکھ ہوا تھا' میں بتا نہیں سکتی۔"

"میں نے کبھی تمہاری انسلٹ نہیں کی۔" وہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔

"کی تھی آپ نے' اس روز جب میں گھر آئی تھی جب آپ نے گھر بیچ دیا تھا۔ میں نے رات کو خواب میں اماں کو دیکھا تھا' مجھے گھر اتنا یاد آیا کہ میں فوراً چلی آئی اور آپ نے میرے آنے کا یہ مطلب نکالا کہ میں پیسے لینے آئی ہوں۔ آپ نے خود اس بات کا احساس دلایا تھا کہ میں غیر ہوں۔ ایک بوجھ ہوں۔"

وہ دوبارہ رونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ ایک لمحے کو چپ سا ہو کر کچھ یاد کرنے لگا پھر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

"تمہارے بارے میں میری یہ رائے کہ تم ایک جلد باز اور بے وقوف لڑکی ہو' ہنڈرڈ پرسنٹ درست ہے۔ اول تو اگر میں یہ سمجھا تھا کہ تم پیسے لینے آئی ہو تو بھی اس میں دکھ زدہ میں مبتلا ہونے کی کوئی بات نہیں تھی۔ تمہارا حق تھا مجھ پر' تم دھونس سے' زبردستی مانگ کر ہر طرح مجھ سے پیسے وصول کر سکتی تھیں۔ میں نے تمہیں کبھی اپنے آپ سے الگ نہیں سمجھا تھا۔"

"جی نہیں' میرا کوئی حق نہیں تھا آپ کے پیسوں پر۔ اور میں پیسے لینے آئی بھی نہیں تھی۔" وہ ناراض لہجے میں بولی۔

"تم اپنی خود ساختہ بدگمانیوں سے کبھی نکلو تو تمہیں پتا چلے کہ میں تمہارا کتنا خیال رکھتا تھا۔ اماں کا غم بھول کر میں صرف تمہاری وجہ سے فوراً زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ جس واقعہ کا تم ذکر کر رہی ہو۔ تمہیں پتا ہے۔ میں ان دنوں کتنا پریشان تھا۔ اور میرے پاس تو کوئی ایسا بھی نہیں تھا جس سے میں اپنی پریشانی شیئر کر سکتا۔ تمہارے لیے تو میں تھا۔ میرے لیے کون تھا؟ تم نے تو کبھی ایک بار بھی بھولے سے نہیں سوچا ہو گا کہ تمہاری طرح میں بھی تنہا ہوں' میرا بھی کوئی نہیں ہے۔ تمہیں اپنی ناراضیوں سے فرصت

ملتی تو کسی اور طرف توجہ دیتیں۔ میں اصولوں پر سمجھوتا نہیں کر سکتا تھا۔ غلط کام نہ کر سکتا تھا نہ کرتے دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی خوشامد اور جی حضوری کر سکتا تھا اور ایسی خصوصیات کے حامل شخص کے ساتھ جو کچھ ہو سکتا ہے' وہ سب میرے ساتھ بھی ہوا' میری جاب میں میرے لیے ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ میں ریزائن کرنے پر مجبور ہو گیا۔ میرے دوستوں نے سمجھایا کہ میں اپنی نام نہاد اصول پرستی اور حق گوئی کو ایک طرف رکھ دوں اور وہی کرنے لگوں جو سب کر رہے ہیں' کیونکہ سیدھا راستہ بہت دشوار ہے۔ اور اس پر تنہا چلنے میں لہولہان ہو جاؤں گا۔ تب بھی میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ اماں بھی مجھے سمجھایا کرتی تھیں کہ میری غیر ضروری انا اور ضد مجھے نقصان پہنچائے گی۔ لیکن میں کسی سمجھوتے کے لیے آمادہ نہ تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے' جب اماں کے انتقال کو بمشکل دو ڈھائی مہینے ہوئے تھے۔ جاب تو چھوڑ دی تھی' اب سوال یہ تھا کہ کیا کروں۔ مجھے خود کو اسٹیبلش کرنا تھا۔ صرف اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے بھی۔ آخر ایک قلاش اور بے کار آدمی کی کزن سے کون شادی کرنے پر آمادہ ہوتا۔ تم مانو یا نہ مانو' میں تمہارا حوالہ ہوں۔ تمہاری زندگی کی خوشیوں کا دارومدار میرے اوپر تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد میں نے ایک کمپیوٹر انسٹیٹیوٹ شروع کرنے کا سوچا۔ ظاہر ہے اس کے لیے سرمایہ درکار تھا۔ گھر تو اس میں رہنے والے لوگوں سے گھر بنتا ہے۔ خالی مکان کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہ تھی سو اسے بارہ لاکھ میں فروخت کر دیا۔ بابا کے اکاؤنٹ میں پانچ چھ لاکھ تھے۔ وہ اور کچھ دوستوں سے ادھار لے کر میں نے اللہ کا نام لے کر کرائے پر جگہ لے کر اپنے انسٹی ٹیوٹ کا آغاز کیا۔

جس دن کا تم کہہ رہی ہو' اس روز مجھے صبح گیارہ بجے وہاں کے مالک سے ڈیل فائنل کرنے جانا تھا۔ رات بھر جاگ کر اپنے انسٹی ٹیوٹ سے متعلق کام کرتا رہا تھا۔ سو صبح آنکھ نہ کھلی۔ بارہ بجے تمہارے آنے پر میری آنکھ کھلی تو تم سے زیادہ اس وقت مجھے وہاں پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ بے چارہ یقیناً" وہاں میرا انتظار کر رہا تھا۔ تم کوئی مہمان تو نہیں تھیں کہ میں کہیں جانے کی جلدی میں ہوں مگر آداب میزبانی سے مجبور ہو کر آئیے بیٹھیے۔ اپنا ہی گھر سمجھیے اور تکلف مت کیجیے۔ قسم کے الفاظ بولتا۔ تم میرے گھر کی ایک فرد تھیں اور اپنے گھر کے افراد کے ساتھ ہمیں جھوٹی اخلاقیات نبھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس قصے میں انسلٹ کہاں ہے۔ بلکہ ناراض تو مجھے ہونا چاہیے کہ تم نے میری پریشانی شیئر نہ کی۔ کبھی اپنائیت کا احساس نہیں دلایا۔" وہ خفگی بھرے انداز میں بولا۔

"آپ خود سے بتا سکتے تھے لیکن آپ کے نزدیک میں اس قابل ہی نہیں تھی کہ مجھے کچھ بتایا جاتا۔ مجھ سے تو ہمیشہ دشمنوں کی طرح باتیں چھپائی گئی ہیں۔ میں تو جیسے جلنے والوں میں سے تھی۔"

وہ روٹھے لہجے میں بولی تو وہ خفگی بھلا کر بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"تمہیں تو کسی ملک کی ملکہ ہونا چاہیے تھا۔ تمہارے سارے انداز بادشاہوں والے ہیں۔ یعنی چت بھی میری اور پٹ بھی میری۔ تمہاری بدگمانیوں کی کوئی انتہا بھی ہے۔ اگر تمہاری دوستوں سے اچھی طرح بات کروں محض تمہاری وجہ سے تو الزام لگتا ہے کہ خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر کرٹسی شو کر رہا ہوں اور اگر ایسا نہ کرتا بداخلاقی سے پیش آتا تو کہا جاتا' میری دوستوں کو اگنور کر کے میری انسلٹ کی گئی ہے۔ گویا ثابت یہ ہوا کہ برائی ہر صورت مجھے ہی ملنی ہے چاہے میں کچھ بھی کر لوں۔"

وہ اس کے سر پر چپت لگاتا ہوا بولا۔ ایک لمحہ کو اپنی اس روز کی کہی باتوں پر کچھ شرمندگی بھی ہوئی کہ اس میں "اس" کا بھی کافی ذکر ہوا تھا اور وہ "اس" کے ذکر کے حوالے سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی شرمندگی سے جھکی آنکھوں کو دیکھ کر مسکرایا۔

"میں ایک بہت ہی برا انسان ہوں۔ خوامخواہ کی تعریفوں نے میرا دماغ خراب کردیا ہے۔ اور ساتویں آسمان پر چڑھا رہتا ہوں۔ یہ سب کچھ تو تمہارے فرشتوں نے کہا تھا اب ذرا یہ بتاؤ کہ میں نے تمہارا دل دکھایا تھا یا تم نے میرا؟ اتنی محبت سے یہ گھر ڈیکوریٹ کیا۔ ہر چیز تمہاری پسند کے مطابق لایا اور جب محترمہ کو لینے گیا تو کتنی بری طرح میرا دل توڑ دیا کہ میرے گھر میں مر کر بھی قدم نہیں رکھیں گی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنی زیادہ بدتمیز اور ضدی ہو تو اسی روز گھسیٹ کر ساتھ لے آتا۔" وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"مجھ سے تو خیر تم ہمیشہ ہی بدگمان رہی ہو لیکن یہ تازہ ترین ناراضی جو کہ بڑی شدید نوعیت کی تھی۔ اس کے اسباب سمجھنے سے میں ابھی تک قاصر ہوں۔"

"میں کوئی ناراض وراض نہیں ہوں۔" وہ صاف مکر گئی۔

"یہ بات بھی آج سمجھ میں آئی ہے کہ اچانک مجھ سے پیسے لینے سے کیوں انکار کردیا تھا۔ میں تو یہی سمجھتا رہا کہ اپنے گھر بدر کیے جانے پر غصہ دکھایا جارہا ہے۔"

وہ کچھ سوچ کر ہنسنے لگا۔ پھر اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس روز تم مجھے اتنی مختلف اور غیر معمولی لگی تھیں کہ میں حیران رہ گیا تھا' ایک ایسی لڑکی جسے آپ شروع سے جانتے ہوں' اس کی عادات مزاج سب سے آگاہ ہوں وہ اچانک کوئی غیر معمولی کام جو اس کی شخصیت سے میچ نہ کرتا ہو کرے تو ہر شخص ہی حیران ہوگا۔ تم جو میرے خیال سے ایک ڈری سہمی' بزدل اور بے وقوف سی لڑکی تھیں۔ اس روز میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی شدت سے مجھے رد کرتی تمام دنیا کی لڑکیوں سے مختلف لگیں۔ میرا یہ خیال کہ تم نے اماں کی صحبت میں رہ کر ڈرنا اور لاڈ کروانا ہی سیکھا ہے۔ اس روز بالکل غلط ثابت ہوگیا۔ تم تو بالکل میرے جیسی تھیں۔ ضدی' اکھڑ اور خود سر' اپنی ناک اور انا کے پیچھے کسی نفع نقصان کی پروا نہ کرنے والی۔ میں جو خود ضدی اور بددماغ مشہور تھا اپنی ہی جیسی عادات زندگی میں پہلی مرتبہ کسی میں دیکھیں اور کسی بھی کون جسے میں ایک عرصہ سے جانتا تھا تو کتنی دیر تک اسے دیکھتا ہی رہا۔ حالانکہ تم مجھے رد کررہی تھیں مجھے اکڑ دکھا رہی تھیں۔ لیکن مجھے پھر بھی اس لمحے تم بہت اچھی لگی تھیں۔ میں اپنی بدلتی کیفیت پر حیران تھا وہاں سے گھر واپس آکر جب میں نے اپنا تجزیہ کیا تو بڑا غیر متوقع جواب سامنے آیا۔ ایک ایسی لڑکی جس کے بارے میں میرا کہنا تھا کہ وہ صرف اور صرف میری کزن ہے اور پھر میں محبت وحبت کو وقت کا زیاں اور بے کار لوگوں کے کرنے کا کام سمجھتا تھا' اچانک تمہارے لیے بڑے مختلف انداز میں سوچنے لگا۔ اپنی اس سوچ کی تبدیلی کے باوجود میں خاموش رہا۔ ایک تو اس لیے کہ تمہاری انا اور ضد مجھے بڑی پیاری لگ رہی تھی' دوسرے اس لیے بھی کہ یہ بات تو میں نے خود چاہی تھی کہ تم خود اعتماد اور بولڈ ہو جاؤ۔ پھر جب تم ایسا کرنے لگی تھیں تو میں تمہیں کیوں روکتا۔ تم جو کچھ کرتی رہیں میں نے کرنے دیا' ہاں البتہ میں ہر جگہ تمہارے ساتھ تھا۔ کسی جگہ تمہیں کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا تو میں اس جگہ تم سے پہلے موجود تھا۔ جسے تم جاسوسی کرنا کہتی تھیں وہ میری محبت تھی۔ مجھے تمہاری پروا تھی میں تمہیں کبھی بھی کوئی دکھ پہنچتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ میری اس خواہش کے نتیجے میں تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو سکتی ہو۔ دنیا میں' میں اکیلا مرد نہیں۔ تمہیں مجھ سے کہیں بہتر' مجھ سے زیادہ محبت کرنے والا کوئی بھی شخص مل سکتا تھا۔ اور پھر تم اب میری گھر میں بند رہنے والی وہ کزن نہ تھیں جس کی زندگی میں واحد مرد میں ہی تھا اور اسی لیے وہ اسے پسند کیا کرتی تھی۔ اپنے آپ کو ایسی صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار کرلیا تھا اگر کوئی ایسا شخص جو ہر لحاظ سے تمہارے قابل ہوتا' تمہارا انتخاب ہوتا تو میں اپنی کسی خواہش کا اظہار کیے بغیر خود تمہاری اس سے شادی کردیتا۔"

وہ کتنی مختلف زبان بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی بے یقینی دیکھ کر مسکرا دیا اور بولا۔

"مت یقین کرو میری باتوں کا' تمہیں تو ویسے بھی مجھے تکلیف پہنچا کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بقول تمہارے' اماں سے کیا وعدہ نبھانے کے لیے۔ جب ہر اتوار تمہارے پاس آتا تو میرے ساتھ کتنا برا سلوک کرتی تھیں۔ گھڑی پر نظریں جمائے بے زاری کا اظہار کرتیں۔ اور اگر بات گلے شکوے کی ہے تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ تم نے تو کبھی اماں کی وجہ سے بھی میرا خیال نہ کیا۔ آخر میں تمہاری پیاری اماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ چلو اسی حوالے سے کبھی تم نے مجھ سے میری خیریت پوچھی۔ کبھی ایک مرتبہ بھی مجھے فون کیا۔ میرا حال دریافت کیا؟ کبھی نہیں۔ کیا سارے فرائض میرے اور حقوق تمہارے تھے۔ اگر تم مشکلات میں تھیں تو آسان زندگی تو میں بھی نہیں گزار رہا تھا' یہ سب مجھے کسی طشتری میں سجا کر پیش نہیں کیا گیا۔ سیدھا راستہ برابر خطرناک اور خار زار ہوتا ہے۔ میں اس راستے پر تنہا چلا' تاکہ تمہارے اور اپنے لیے ایک بہتر زندگی حاصل کرسکوں۔" اپنی بات ختم کرکے وہ اسے دیکھنے لگا جو خاموش بیٹھی ایک ٹک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"میں نے ہر بات تمہیں سچ سچ بتادی۔ اب تم بھی جلدی سے بتادو کہ اتنی شدید ناراضی کس بات پر تھی۔ مجھے پتا ہے کہ یہ نوکری کسی انتہائی غصے کے عالم میں کی گئی تھی۔"

"میری آپ سے کوئی ناراضی نہیں۔" وہ اپنی کوئی بھی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"شفق سے تو تم پہلے بھی مل چکی تھیں اور تمہارے چہرے کے غضب ناک تاثرات کو میں نے بڑا انجوائے بھی کیا تھا۔ اتنے دن گزرنے کے بعد اس بات پر اب تو ناراضی ہو نہیں سکتی۔"

وہ کچھ سوچتا ہوا بول رہا تھا جیسے بات کا سرا پکڑنا چاہتا ہو۔ اور اس روز اکڑ کتنا رہی تھیں۔ میں نے کتنا بلایا تھا کہ اندر چلو لیکن گردن اکڑائے بیٹھی رہیں۔" اسے ایک اور بات یاد آئی تو شکوہ کر بیٹھا۔

"میں کیوں اندر جاتی بن بلائے مہمان کی طرح۔ پھر وہ آپ کی لاڈلی ساتھ تو تھیں۔ میری کیا ضرورت تھی۔"

اس بات پر وہ خود کو روک نہیں پائی اور بے اختیار بول بیٹھی۔ وہ اس کی بات سے لطف اندوز ہوتا کتنی دیر تک ہنستا رہا۔

"وہ اپنے بارے میں تمہارے اتنے شاندار کمنٹس سن لے تو صدمے سے بے ہوش ہو جائے۔ ویسے تمہاری یہ جیلسی مجھے اتنی اچھی لگ رہی ہے کہ کوئی صفائی دینے کا دل نہیں چاہ رہا لیکن پھر بھی تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے وہ میرے ساتھ ایم اے میں تھی۔ اچھی ذہین لڑکی ہے اور آج کل میرے ہی دفتر میں کام کر رہی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میرے ایف بی سی والے آفس کا۔ آخر جاسوسی کرتی تم وہاں پہنچی تھیں۔"

وہ شریر نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ تو وہ ایک لمحہ کو جھینپ کر رہ گئی۔ پھر اپنی اس کیفیت سے چھٹکارا پاتی طنزیہ انداز میں بولی۔

"اور اس سے جتنی بھی اس کی ذہانت ہی کی وجہ سے کی گئی تھی۔"

"منگنی۔" وہ اس نئے الزام پر سکتے کی کیفیت میں تھا۔ "تم سے کس نے کہا؟"

"کسی نے بھی کہا بات تو سچ ہے۔" وہ اپنی بات پر زور دیتی بولی۔

"اچھا تو اس بات پر اتنا شدید غصہ تھا۔ وہ صرف میری ایک کولیگ ہے۔ لوگوں کو خوامخواہ دوسروں کو اسکینڈلائز کرنے کی عادت ہوتی ہے۔"

"صرف وہی ایک کولیگ تھی۔ اور اتنی فارغ بھی کہ ہر وقت دم چھلا بنی ساتھ رہے۔"

"شکر ہے اب شکووں میں کچھ اپنائیت تو محسوس ہوئی۔ تمہیں اگر وہ اتنی بری لگتی ہے تو میں اس سے کہہ دوں گا کہ کہیں اور نوکری کر لے اور مجھ سے نہ ملے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم یہ بات اپنے منہ سے کہو۔" وہ چہرے پر زبردستی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا، لیکن آنکھیں کسی شرارت سے مسکرا رہی تھیں۔

"میں کیوں کہوں، میری بلا سے جس سے چاہے ملیں۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر لاپروائی سے بولی۔

"بالکل ٹھیک کہتی ہیں تمہاری دوستیں، تم گھڑی دیکھتی رہنا اور تمہارا ٹائی ٹینک ڈوب جائے گا۔ وہ تو کہو کہ جہاز کا کپتان ہی کچھ ہوش مند ثابت ہوا، ورنہ تم نے تو ڈبونے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔" وہ ہنس پڑا۔

"بڑی تیز چیز ہو۔ میں فضول ہی تمہیں معصوم اور بھولی بھالی سمجھتا رہا۔ میرے ساتھ بن رہی ہو۔" وہ اس کا سر پکڑ کر اپنی طرف کرتا ہوا بولا۔ "تم سے تو کہیں بہتر شفق ہے۔ جو میرے ساتھ اتنی اچھی طرح باتیں کرتی ہے، میرا خیال رکھتی ہے۔ تمہاری طرح کاٹ کھانے کو نہیں دوڑتی۔ میرا خیال ہے مجھے سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچنا چاہیے۔" وہ اسے کچھ بولنے کے لیے اکسانے لگا۔

"سوچیں ضرور سوچیں۔ میں نے کب روکا ہے۔" وہ بیگانگی سے بولی۔

"یعنی یہ کہ بار آخر کار مجھے ہی ماننی پڑے گی۔ چلو یونہی سہی اپنی جھوٹی انا کو اونچا کیے بیٹھی رہو۔ میں ہی بار مان لیتا ہوں۔" وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتا ہوا بولا۔

"تو بات یہ ہے فاطمہ بی بی! کہ میرے ماں باپ یا کوئی اور رشتے دار تو ہے نہیں۔ اس لیے اپنا رشتہ لے کر میں خود ہی آپ کے سامنے حاضر ہوا ہوں۔ مجھے شرف قبولیت بخش کر میری عزت افزائی فرمائیے۔ دیکھیے میں ایک خوبرو لائق فائق اور نیک دل جوان ہوں، مجھ سے شادی کر کے آپ یقیناً بہت خوش رہیں گی۔"

وہ اس کی بات پر کھنکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اسے لگا، وہ کتنی مدت بعد اپنے دل کی مکمل آمادگی کے ساتھ ہنس رہی ہے۔ سچی اور خالص ہنسی۔ وہ بڑی توجہ سے اسے ہنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں اب بھی مجھ سے کوئی شکوہ ہے؟" وہ سوال کرنے لگا۔

"ہاں ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"اوہ میرے اللہ! اب کیا بات رہ گئی؟" وہ اپنے خیال سے تمام شکایتیں دور کر چکا تھا۔

"اس کو اپنے آفس سے نکال دیں۔"

وہ اپنے دل کی خواہش کا اظہار برملا کر رہی تھی۔ اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"تمہارے کہنے سے نکال دوں گا، ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اور اگلے مہینے شادی ہونے والی ہے۔"

"کیا ہے؟" وہ چیخی "اتنی دیر سے مجھے الو بنا رہے تھے۔"

"پہلے سے بتا دیتا تو تمہاری وہ جیلس شکل کیسے دیکھ پاتا۔" وہ اپنے بے وقوف بنائے جانے پر کچھ ناراض سی ہو کر بیٹھ گئی۔

"تم آج بھی اتنی ہی بے وقوف ہو جتنی پہلے تھیں۔ میرے لنچ کے مرکزی خیال نہ لکھ کر دینے پر ناراض ہونے والی۔ ویسے اب اگر تم کہو تو بجائے مرکزی خیال کے میں تمہاری شان میں ایک آدھ بے وزن قسم کی نظم ضرور کہہ سکتا ہوں۔"

وہ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پاس رکھی پلیٹ میں سے پراٹھا کھانے لگی۔ تو وہ ٹوکتے ہوئے بولا۔

"کم از کم منہ ہی دھو کر آجاؤ۔ تمہاری اس شکل سے اب مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

اسے کھانے میں مگن دیکھ کر پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"جاؤ حلیہ درست کر کے آؤ۔ اتنی خوفناک لگ رہی ہو۔"

"اسی شکل کے پیچھے پورے شہر میں مارے مارے پھر رہے تھے۔" وہ دروازے کے قریب ہو کر بولی اور جھٹکے سے باہر نکل گئی تو پیچھے اس کا جان دار قہقہہ سنائی دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے جس کی آواز سنی، وہ چیخا کہہ رہا تھا۔

"فریزر میں آئس کریم رکھی ہے۔ وہ لیتی آنا۔"

کچن کی طرف جاتے اس کی نظر لاؤنج میں دیوار پر ٹنگی اس تصویر پر پڑی جس میں وہ اماں اور حسن ایک ساتھ کھڑے تھے۔ درمیان میں اماں اپنی پُروقار شخصیت سمیت مسکراتی ہوئی کھڑی تھیں۔ اور ان کی دائیں جانب وہ اور بائیں جانب حسن کھڑا تھا۔ وہ چلتی ہوئی تصویر کے پاس آکر رک گئی اور بڑی محبت سے اپنی ماں کا نورانی چہرہ تکنے لگی۔

"میں خود کو تنہا سمجھ کر تقدیر سے شاکی اور مستقبل سے ناامید رہا کرتی تھی۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ شاہراہِ حیات پر میں تنہا نہیں، وہ قدم قدم سے قدم ملائے میرا ہاتھ تھامے ہر لمحہ میرے ساتھ تھا۔ پیاری اماں! آج اگر آپ ہمارے ساتھ ہوتیں تو ہمارے اس فیصلے پر یقیناً آپ بھی بہت خوش ہوتیں۔"

وہ بھلملاتی نگاہوں سے اماں کو دیکھ رہی تھی لیکن یہ آنسو خوشی کے اور تشکر کے تھے۔

شگفتہ محمود کی مرتب کردہ
"خاتون کا دسترخوان" اور "کرن دسترخوان"
کے بعد
خوبصورت رنگین تصاویر کے ساتھ پہلی بار پیش
کھانوں کی مکمل کتاب
چائنیز کھانے
قیمت 150/- روپے
ڈاک خرچ 16/- روپے
منگوانے کا پتا
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار کراچی